مؤلفۂ

مصلودرد مولانا عبدالباری آسی

باہتمام

سید فدا حسین ہاشمی بی۔اے (علیگ)

یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ وکٹوریہ اسٹریٹ

میں طبع ہوئے

مقدمہ

شاعری اور فلسفہ دونوں کے لئے تخییل کی یکساں ضرورت ہے۔ ایک جگہ تخییل ذوقی اور وجدانی کیفیت بن کر رہ جاتی ہے دوسری جگہ عقل و ادراک کی رہنمائی کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ عموماً اعلے پایہ کے شاعر اعلیٰ پایہ کے فلسفی بھی ہوتے ہیں شعر اگر صحیح معنی میں شعر ہے تو حقیقت اور واقعیت سے جدا نہیں ہو سکتا اور حقائق کا انکشاف ہی فلسفہ کی غرض و غایت ہے۔

حقیقی شاعری حکمت و موعظت کے جواہر پاروں سے مالامال ہے شعر حکمت ہے، شاعری کا سب سے بڑا کمال اور بلند ترین معیار اسکا تاثر ہے اور تاثر کا مقصد اور نتیجہ روح کی رفعت اور سرور ہے۔

کیونکہ تخییل کی کوئی حد و نہایت نہیں اور شعر میں اس سے
کام لینے کے کوئی خاص اصول اور ضوابط مقرر نہیں ہو سکتے۔
اسلیے اکثر شعرا جنھیں قدرت نے ذوق سلیم عطا کرنے میں زیادہ فیاضی
سے کام نہیں لیا تھا جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے اور مبالغہ کی
مدد سے ناممکنات اور محالات کا ایک طلسم خانہ تیار کر دیا جسے
حقیقی شعریت سے کوئی واسطہ نہیں، ایشیائی شعرا نے اسمیں سب سے
زیادہ حصہ لیا چنانچہ یہی وجہ ہوئی کہ رفتہ رفتہ ہماری شاعری
ہماری روزانہ زندگی سے دور ہٹتی گئی اور ہٹتے ہٹتے یہاں تک
مغائرت بڑھ گئی کہ شعر کی خوبی کا معیار ہی ناممکن کو ممکن ثابت
کرنا اور فرضی باتوں کو حقیقی ظاہر کرنا سمجھا جانے لگا اور اسطرح
شعر کی اصلی غرض و غائت فوت ہو گئی۔

فلسفیوں نے تخییل سے کام لیتے وقت علت و معلول کے سلسلہ کو
ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور حقائق کے انکشاف میں چند مقررہ اصول

وضوابط پر کاربند ہو کر عقل و ادراک کو شمع ہدایت بنایا یہی
سبب ہے کہ وہ حقیقت و واقعیت سے متصل رہے اور حیات انسانی
سے قریب تر ہوتے گئے چنانچہ جب وہ ایوان فلسفہ سے نکل کر
زندگی کی عام شاہراہ پر گامزن ہوتے ہیں اور اپنے اردگرد کی
چیزوں اور دُنیا کے معمولی واقعات اور حالات پر نظر ڈالتے ہیں
اور اظہار رائے کرتے ہیں تو کچھ ایسی چبھتی ہوئی بات کہتے ہیں کہ تاثیر
سے لبریز ہوتی ہے اور دل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ یہی حقیقی شعریت
ہے۔

حکما اور فلاسفہ کے ان مقولوں کی بنا بھی زیادہ تر تخیل ہی پر ہے
لیکن اس تخیل کی نشو ونما منطقی استدلال کے سایہ میں ہوئی ہے اور
مبالغہ کی بے اعتدالیاں اسپر اپنا رنگ نہیں جما سکتی ہیں یہی وجہ ہے
کہ یہ مقولے ایشیائی شاعرانہ تخئیل کی طرح حقیقت سے بعید نہیں ہوئے
ہیں، اور گو بظاہر ان کی یہ باتیں سیدھی سادی اور سطحی معلوم ہوتی

ہیں لیکن حقیقت اسکے بالکل برعکس ہے کیونکہ وہ ہمیشہ نہایت گہری
اور تہہ کی بات کہتے ہیں اور سنگریزوں میں سے چھانٹ کر موتی نکال لاتے ہیں
دنیا کی ہر زبان نے حکماء اور فلاسفہ کے ان مقولوں کو بھی انکے
فلسفیانہ اور حکیمانہ مسلمات کے ساتھ ساتھ محفوظ رکھنے کی کوشش کی
ہے۔ اردو میں بھی اب سے پہلے متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں
سے بعض میں صرف حکماء کے مقولے فراہم کر کے شائع کر دیے گئے
ہیں اور بعض میں ان کے سوانح حیات کے ساتھ ان کے زریں اقوال
پر تبصرہ کیا گیا ہے

اردو شعرا بھی اقوال حکماء کے ان جواہر پاروں سے محروم نہیں
رہے ہیں۔ حالی کی مسدس مدوجزر اسلام کا پہلا ہی بند بقراط کے
مقولے سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اور بھی
بہت سے مقولوں کو نظم کیا ہے مولانا محمد اسمٰعیل نے بھی کبھی کبھی
اس طرف توجہ کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ واقعات و مقالات

کو نظم کرنے میں جو کمال مولانا موصوف کو تھا وہ حالی کو بھی نصیب

نہیں ہوا۔

میری رائے میں آسی جن کی نظموں کا مجموعہ "بصائر"

کے نام سے آپ کے پیش نظر ہے مقولوں کو نظم کرنے میں اگر مولانا

اسمٰعیل سے سبقت نہیں لے جا سکے ہیں تو کم بھی نہیں رہے ہیں

بحیثیت غزل گو کے آسی کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس میں شک

نہیں کہ لکھنؤ کے طویل قیام سے تکلفات اور تصنعات کی اس

سرزمین کا اثر کہیں کہیں ان کے کلام میں جھلکتا ہے لیکن بالآخر

درد اور سوز و گداز اور ان کیفیات کے اظہار کا وہ مخصوص انداز

جو دہلی کے سوا ہندوستان کے اور کسی خطے کو نصیب نہیں ہوا

پکار اٹھتا ہے کہ

"ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے"

آسی کا وطن ایک چھوٹا سا قصبہ الدن ہے جو دہلی اور

میرٹھ سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ایسے ایسے صاحب کمال اس چھوٹی سی بستی سے نکلے جن کے آگے بڑے بڑے ترقی یافتہ شہروں کے علماء اور اُدبانے زانوے ادب تہ کیا ہے۔ آسی نے بھی اسی متبرک اور مردم خیز خطے میں نشو و نما پائی یہی سبب ہی کہ وہ علم و ادب کے جس میدان میں گام زن ہوتے ہیں الگزنڈر سلکرک کی طرح بلا شرکت غیرے اسکے مالک بنجاتے ہیں۔

ان نظموں سے آسی کی حقیقی شاعرانہ منزلت کا تو اندازہ نہیں ہوتا لیکن اُنکا نہایت سادہ اور دل نشیں اسلوب بیان بندش کی چُستی الفاظ کا دردبست یہ سب چیزیں ان کی مشق سخن کا بہانگ دہل اعلان کر رہی ہیں، روانی اور الفاظ کے انتخاب اور ان کے استعمال میں خوش سلیقگی کا یہ عالم ہے کہ بعض نظمیں سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

خیال آفرینی کے ساتھ الفاظ کے انتخاب اور ان کی نشست

میں زیادہ کدوکاوش کی ضرورت نہیں پڑتی کہ خیال اپنے ساتھ خود اپنی پسند کا جامہ لیکر نکلتا ہے لیکن اگر خیال کسی دوسرے شخص کا ہو تو اُس کو الفاظ کا جامہ پہنانا آسان نہیں ہے، ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ بھی اسی لئے مشکل سمجھا جاتا ہے کہ ترجمہ میں خیال دوسرے شخص کا ہوتا ہے اور اس خیال کو اپنے الفاظ میں ادا کرنا پڑتا ہے لیکن کسی دوسرے شخص کے خیال کو نظم کرنا ترجمہ سے کہیں زیادہ مشکل ہے، وزن کی پابندی الفاظ کے انتخاب میں آزادی قائم نہیں رہنے دیتی اور پھر ردیف وقافیہ کے قیود اس آزادی کے دائرہ کو اور بھی محدود کر دیتے ہیں ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم آسی کے "بصائر" کا مطالعہ کریں تو ان کے کمال کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

آسی اقبال کی طرح فلسفی نہیں ہیں یا کم سے کم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے فلسفہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا ہے

لیکن اس کے باوجود فلسفہ کی طرف ان کے طبعی رجحان سے بھی انکار نہیں ہو سکتا خود ان مقولوں کا نظم کرنا ہی میرے اس دعوے کی بین دلیل ہے پھر ان کے تغزل میں بھی جگہ جگہ حقائق و معارف کی جھلک نظر آتی ہے، مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

بیکار کوئی چیز نہیں ہے زمانے میں
حتی کہ موت بھی ہے مری زندگی کا راز

موت کو زندگی کا راز کہنا ایک نہایت لطیف استعارہ کے علاوہ ایسی فلسفیانہ تخیل کی طرف ہمیں کھینچ کر لے جاتا ہے جس پر جس قدر غور کیا جائے حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

مجھے آسی کا ایک اور شعر یاد آیا جس میں ایک ایسی حقیقت کی طرف پُر کیف شاعرانہ انداز سے اشارہ کر کے جو ہر شخص کے روزانہ تجربہ میں آتی ہے خدائے واحد کی قدرت کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

سہی درست ہی انکار قدرتِ خالق
جو چاہتا ہوں میں آسیؔ وہ کیوں نہیں ہوتا

آسیؔ کا رنگ تغزل مجھے مصحفیؔ سے بہت زیادہ ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے، اور ایک رنگ تغزل ہی کیا ان کی تو ساری زندگی کچھ اسی رنگ سے گذری ہے، وہی بے خودی و بیخبری نہ تن بدن کا ہوش نہ لباس کی خبر، وہی شاگردوں کا جم غفیر، وہی غزلوں کی بخشش وہی پُرگوئی، اور زود نویسی یہاں اس بحث کا موقعہ نہیں، انشاءاللہ آیندہ بشرط فرصت اس دلچسپ موضوع پر تفصیل کے ساتھ لکھنے کا ارادہ ہے۔

"بصائر" میں کہیں کہیں خامیاں بھی رہ گئی ہیں اور کوئی بشر اس سے خالی نہیں، ایک خامی تو مجھے یہ نظر آتی ہے کہ آسیؔ صاحب نے بعض ایسے مقولے بھی نظم کر دئے ہیں جن میں کوئی ندرت نہ تھی، اسکے علاوہ بعض مقامات پر زبان کی فرو گذاشتیں بھی ہیں۔

مثلاً صفحہ ۱۵ پر ایک مصرعہ ہے

جب سُن چکا تمام نصائح کو دوست کی

نصائح مذکر ہے مونث نہیں مثلاً جیسا کہ اس شعر میں نظم ہوا ہے۔
اسکے علاوہ "کو" کا استعمال بھی یہاں صحیح نہیں ہے۔ صحیح فقرہ یوں ہونا چاہیئے۔ "جب دوست کے تمام نصائح کو سن چکا" یا مثلاً صفحہ ۱۷ پر۔

جنھیں معرکوں میں کیا تم نے زیر

توانا تھے تم سے وہ یا ناتواں،

برابر تھے یا تم سے طاقت میں وہ

کرو صاف صاف اسکو مجھ سے بیاں

چوتھے مصرعہ میں "اسکو" کا استعمال صحیح نہیں ہے اس کی جگہ "یہ" ہونا چاہیئے۔ کہیں کہیں تنافر بھی پیدا ہوگیا ہے جس سے پرہیز لازم تھا مثلاً صفحہ ۳۰ پر ایک مصرعہ ہے

لڑیں گے ہم اب اس سے بسایہ میں رہ کر

مگر جب ہم ان مشکلات کا اندازہ کرتے ہیں جو ان مقولوں کو نظم کرنے میں حائل ہوئی ہوں گی اور ان محاسن کو دیکھتے ہیں جو مجموعی طور پر ان نظموں میں موجود ہیں تو یہ فرو گذاشتیں سہو کے حدود میں آجاتی ہیں اور اسقدر ہلکی ہو جاتی ہیں کہ نظر ان پر ٹھوکر نہیں کھاتی۔

"بصائر" میں جو حکمت اور موعظت کے جواہر پارے فراہم کئے گئے ہیں اور انھیں نہایت سلیقہ کے ساتھ نظم کی لڑیوں میں منسلک کیا گیا ہے خدا کرے کہ ملک و قوم کو اس سے مستفید ہونیکا احساس پیدا ہو جائے اور آسی کی محنت ٹھکانے لگے۔

نظموں کے بعد جو سب سے بڑی چیز اس مجموعہ میں رہ جاتی ہے وہ رباعیات کا حصہ ہے۔ یہ قطعات کے حصے سے بالکل جدا ہے۔ اور اسکی بنا جس رنگ پر رکھی گئی ہے اسکو قطعات سے اسکے سوا

کوئی علاقہ نہیں ہے کہ ان میں بھی بہت سی جگہ نصائح کے جواہر آبدار کو منسلک کیا گیا ہے۔ رباعیات کے نمونے بہت سے ہمارے یہاں موجود ہیں۔ عمر خیام۔ ابو سعید ابو الخیر۔ سرمد۔ عطار۔ اور بہت سے بزرگوں نے اس صنف میں اپنے مساعی جمیلہ کے دفتر کے دفتر پیش کئے ہیں۔ مگر ہر ایک خاص رنگ کے دائرے میں محدود ہے۔ عمر خیام کا فلسفہ یہی کہ فانی دنیا کے لذات بھی فانی ہیں۔ زیست بے بقا ہے۔ اگر اس سے متمتع ہونے کی تمنا ہے تو اسی تھوڑی سی فرصت میں متمتع ہو جاؤ۔ ابو سعید ابو الخیر رحہ کی رباعیاں ذوق تفرید و تجرید کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ سرمد بھی شراب جذب و سلوک کے مدہوش ہیں۔ عطار کے یہاں وہی اگلی خلقی بزرگی ہے۔ جو مواعظ کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ مگر آسی نے خذ ما صفا و دع ما کدر کو پیش نظر رکھا ہے۔ پابندی اور یک رنگی کی زنجیر کو توڑ کر آزادی حاصل کر لی ہے اور ہر طرف اور ہر گوشہ کی سیر کی ہے کہیں ایک صوفی با صفا کا حال ہے۔ کہیں ایک واعظ بے ریا کا قال ہے

کہیں ایک رندِ لاابالی کی قدح نوشی ہے۔ کہیں ایک عاشق دردمند کے جذبات کی گرمجوشی ہے کہیں خیام کا تتبع ہو۔ کہیں سرمد کا کہیں عطار کی ہم قدمی ہو کہیں ابوسعید کی۔

تخیل آفرینی کے زور کا یہ عالم ہو کہ ہر خیال میں پر پرواز لگ گئے ہیں اور وہ پری بنکر فضائے شعر میں اڑتا نظر آتا ہو۔ اسکی آب وتاب دیکھنے والی کی نظر خیرہ ہو جاتی ہو مگر تخیل کے عمق۔ اور خیال کی گہرائی کے باوجود بھی وہ ایک جگہ بھی صفائی اور روانی کے جادہ سے سر مو نہیں ہٹتے۔ جذبات کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

ایک دو جگہ نہیں بلکہ بیسیوں جگہ خیالات بدیع اور نادر ہیں جنھیں صفائی اور حسن بیان نے چار چاند لگا دئے ہیں ہم صرف ایک ایک رباعی ہر رنگ کی بغیر کسی تنقید کے آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں باقی تمام رباعیات آپ کے پیش نظر ہیں ممکن ہے دیکھنے کے بعد آپ بھی ہمارے ہم نوا اور ہم خیال ہو جائیں۔

جذبات

ہونٹوں کو ہنسی سے آہ سینا ہی پڑا
جام مئے رنج و غصہ پینا ہی پڑا

موت اپنی مراد پر نہ آئی افسوس
اوروں کی مراد بنکے جینا ہی پڑا

عبرت

جو دل ہی یہاں غموں کا گنجینہ ہے
داغوں سے بھرا ہوا ہی جو سینہ ہے

میں بھی حیران ہوں اور جہاں بھی حیراں
آئینہ کے سامنے اک آئینہ ہے

بے ثباتی عیش

اک محفل عیش میں ہوا میرا گذر
دیکھا اک خشک پھول کو مجمر پر

پوچھا میں نے کہ کیوں جلاتے ہیں اسے
بولا کہ چمن میں ہنس لیا تھا دم بھر

حسیات

ہر بزم میں اک قرب اسے حاصل تھا
یہ باعث ہنگامۂ صد محفل تھا

جسپر سے گزر رہا ہے تو اے غافل   یہ دشت غبار بھی کسیدن دل تھا

میں اطناب کلام سے گھبرا کر صرف انھیں رباعیات پر اکتفا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا کرے وہ شعرا بھی جو صرف الفاظ کا گرونا بنا کر شعر کہنا چاہتے ہیں۔ اس رنگ کا اتباع کریں۔

لکھنؤ

حامد اللہ افسر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خدا عقل میں نہیں آسکتا

کہا کسی نے یہ سقراط سے کہ اے حضرت
بتاؤ ہم کو جو وصف خدائے اکبر ہے
کہا کہ وصف کی اس کے بڑی صفت یہ ہے
کہ وصف اُس کا تمہاری سمجھ سے باہر ہے

اپنے نفس کی معرفت سخت ضروری ہے

کسی حکیم سے پوچھا گیا خدا کیا ہے
دیا حکیم نے فوراً یہ مختصر سا جواب
جب اپنی ذات کو اس وقت تک نہیں سمجھے
خدا کی ذات کو پھر کیا سمجھ سکیں گے جناب

جاہل دوست نہیں ہو سکتا

کسی نے ارسطو سے اکدن یہ پوچھا
کہ ہو دوست جاہل تو کیا ہے نتیجہ

کہا اُسنے جاہل ہے خود اپنا دشمن
وہ کیا دوست ہوگا جہا میں کسی کا

مضحکہ اور نصیحت

مرنے سے الدین کے اک نوجوان کو
ترکہ زمین و نقد کا حد سے سوا ملا

لیکن ہے نوجوانوں کا دستور جسطرح
عیاشیوں کا اُسکو بھی چسکا یونہی پڑا

روز اسکا روز عید تھا شب تھی شب برات
عیش و سرور و سور کا جاری تھا سلسلا

تھی جائداد جتنی وہ کرنے لگا فروخت
تھی جسقدر زمین وہ سب بیچنے لگا

بے اعتدالیوں کا ہوا اسنا زور شور
کچھ دن کے بعد مفلس و قلاش ہو گیا

معمول سے زیادہ ہوا جبکہ تنگدست
اک روز اسکو دیکھکے سقراط نے کہا

کھایا ہے نوجوانوں کو اکثر زمین نے
لیکن یہ نوجوان زمیں کو بھی کھا گیا

مدت تعلیم کا تعین

چلا جاتا تھا افلاطوں سر راہ
کسی نے اس سے پوچھا آکے ناگاہ

کہ زیبا کب تلک ہے کسب حکمت
کہا جب تک ہے نازیبا جہالت

برکت ہمت کیساتھ ہے

سکندر کو مخبر نے آکر خبر دی
کہ دشمن سے لڑنے کی ہمت ہو کیونکر

گھٹا چھائی ہے تیغ فوج عدو کی
تو برق فنا بھی گرے گی مقرر

سکندر نے ہنسکر کہا خوف کیا ہے
لڑیں گے ہم اب اُس سے سایہ میں رہ کر
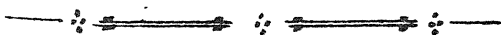
حقیقت شاہی

پوچھا اک مور نے سلیماں سے
ملی شاہی یہ آپ کو کیونکر

بولے خاتم کی وجہ سے میرے
ہوئے محکوم سب یہ جن و بشر

کہا کس کام کی ہے وہ شاہی
ہو بنا جسکی ایک خاتم پر

بے ثباتیِ عیش

نہیں ہے راحت و آرام کی جگہ دنیا
ہو کس طرح سے یہاں شاد دلِ ناشاد

ہوا پہ تخت سلیماں یہ کہتا جاتا تھا
کہ بادشاہی عالم کی ہے بنا برباد

تاثیر توبہ

آمادۂ فسوق ہوا جب ہر ایک شخص
اور اہل نینوا میں ہوئی کثرت گناہ

کی انکے حق میں حضرت یونس نے بد دُعا — اور دی خبر کہ یاد رکھ اے قوم رو سیاہ

چالیس دن کے بعد عذاب خدائی پاک — آئیگا اور ہوگا تجھے اُس سے انتباہ

جب یہ سُنا تو چھوڑ کے فسق و فجور کو — مانگی دعا یہ سب نے خدا سے کہ یا اللہ

ہم چھوڑتے ہیں کفر و فسوق و فجور کو — اب تو بھی ہم پہ رحم کر اور ہمکو دے پناہ

آئے ہیں تیری در پہ یہ سمجھ کر تجھے کریم — آب کرم سے دھو دے عمل نامہ سیاہ

آیا جو بحر رحمت خالق میں اک جوش — اُن بیکسوں کے حال پہ کی لطف کی نگاہ

چالیس روز گذرے مگر کچھ نہیں ہوا — تھے خیر و عافیت سے وہاں سب گدا و شاہ

خجلت کے ساتھ حضرت یونس کو رنج تھا — مجبور ہو کے لی سوئے طرسیس انھوں نے راہ

اور کی دعا کہ موت دے یارب تو اب مجھے — رنج دلی سے حال ہے میرا بہت تباہ

حکم خدا ہوا کہ یہ رنجش فضول ہے — پھر نینوا میں جاکے رہو تم بعز و جاہ

رہنے لگے وہ جھونپڑی جنگل میں ڈالکر — پیدا ہوئی بحکم خدا اُس پر اک گیاہ

ان سیل تھی ایسے ہوئی انکو کچھ خوشی | کیڑے نے کھا لیا اسے لیکن دم پگاہ

یہ حال دیکھنے سے ہوا پھر انھیں ملال | اُمید کا جہان نظر میں ہوا سیاہ

حکم خدا ہوا کہ سن اے یونس حزیں | عبرت سے واقعات پہ ڈال اک ذرا نگاہ

اک گھاس کے اُجڑنے سے تجھ کو یہ رنج ہے

ہم ایک پورے شہر کو کیونکر کریں تباہ

عاشق خوفِ جدائی سے کبھی علیحدہ نہیں رہتا

ملکے بھی یوسف صدیق سے یعقوب حزیں | رہتے تھے پہلے کی مانند ملول و غمگیں

پوچھا لوگوں نے کہ اب رونے کا باعث کیا ہے | اب تو پہلی سی وہ یوسف کی جدائی بھی نہیں

بولے یعقوب بچھڑنے کا تھا رونا پہلے

اب یہ رونا ہے کہ ملکر نہ بچھڑ جائیں کہیں

تکلیف و آلام لازمۂ محبت میں

کسی شخص نے آگے یوسف کے اک دن
بڑے شدّ و مد سے محبت جتائی

کہا اس سے یوسف نے ای بھائی میں نے
محبت میں کچھ بھی بھلائی نہ پائی

مرے باپ نے کی محبت جو مجھ سے
تو دشمن ہوے اُس محبت سے بھائی

دُوبارہ زلیخا نے کی جب محبت
تو ظاہر ہی وہ مجھ پہ جو آفت آئی

مقتضائے رحمِ و انصاف

تھے فرماں روا مصر میں جبکہ یوسف
تو کرتے رعایا پہ اتنا تلطّف

کہ کھانا نہ کھاتے کبھی سیر ہو کر
سبب پوچھتے تھے تو کہتے تھے رو کر

جو میں سیر ہو کر کسی روز کھاؤں
تو بھوکوں کی تکلیف کو بھول جاؤں

احترام معبود

ایکدن طور پہ اللہ سے موسےٰ نے کہا / اے مرے رب کریم اے مرے علّام و دود

میرے اس کلبۂ تاریک میں ایسی شی ہی / تیری قدرت کے خزانے میں بھی جو ہی مفقود

پوچھا اللہ نے کیا چیز ہی وہ اے موسےٰ / میری قدرت کے خزانے میں نہیں جو موجود

کہا موسےٰ نے کہ معبود ہی تجھسا مرے پاس / پاس تیرے نہیں لیکن کوئی تجھسا معبود

راز و نیاز

ملک الموت سے بولے یہ دم نزع خلیل / دوست کی روح بھلا قبض بھی کرتا ہی کوئی

وحی آئی کہ تمھاری طرح اے ابراہیم / دوست کے ملنے سے پر دوست بھی ڈرتا ہی کوئی

عسرت کی عشرت کے موافق برداشت کرو

مبتلائے کربت آلام جب ایوب تھے
انکی بیوی نے دعا مانگی کہ اے فریاد رس

رحم کر اس بندۂ صابر کے حال زار پر
حضرت ایوب نے سنکر کہا اس سے کہ بس

ہمنے ستر سال لوٹے ہیں مسرت کے مزے
صبر غم پر بھی ہمیں لازم ہے اب ستر برس

زبان خلق کو کوئی نہیں روک سکتا

عرض کی موسیٰ نے یارب مجھکو یہ افراد قوم
وہ نہ کہنے پائیں جو باتیں مرے قابل نہیں

یہ جواب آیا کہ اے میرے نبی میرے کلیم
تم تو تم یہ مرتبہ تو ہمکو بھی حاصل نہیں

غم بے محل

مر گیا تھا ایک بچہ حضرت داؤد کا
حضرت کے دل کو اس سے بڑا صدمہ ہوا

کرتے رہتے رات دن ہیں آپ کیوں جزع فزع
حکم حق پہونچا کہ ہمکو وجوب اسکا ذرا

جب بنایا تھا اُسے فتنہ تمہارے واسطے
کیا سبب اسوقت آخر اسقدر فرحت کا تھا

اب کہ ہمنے باعث رحمت بنایا ہی اُسے
رات دن کس واسطے کرتے ہو تم آہ و بکا

بُری صنعت سے صانع پر حرف آتا ہی

دیکھ کر لقمان کی بدصورتی کو ایکدن
آگئی اک شخص کے لب پر حقارت کی ہنسی

دیکھ کر لقمان نے پوچھا کہ کیوں اے بیوقوف
یہ خطا تو نقش کی سمجھا ہی یا نقاش کی

پاسِ ادب

اکمرتبہ لقمان کو ککڑی کی کچھ کی پھانک
آقا نے بھری بزم میں کھانے کیلئے دی

جب کھا چلے لقمان تو آقا نے یہ پوچھا
بتلاؤ کہ تھی ذائقہ میں پھانک یہ کیسی

لقمان نے جواباً یہ کہا ازرہ توصیف
اسدرجہ یہ شیریں تھی کہ کیا بات ہے اسکی

آقا نے بھی لقمان سے تعریف یہ سُنکر
کھائی وہی ککڑی تو وہ بدذائقہ نکلی

لقمان سے ترش ہوکے کہا ازرہ غصہ
تو جیسی بتاتا ہے یہ ویسی تو نہیں تھی

لقمان نے ادب سے کہا جن ہاتھوں سے اکثر
ملتی رہی ہیں سیکڑوں چیزیں مجھے میٹھی

اک تب ان ہاتھوں سے کھا کر کوئی شی تلخ
کس منھ سے سر بزم بتا دیتا میں کڑوی

سعیِ بے محل

اک معلم کو یہ بقراط نے دیکھا اک روز
کہ اُسے اپنی لیاقت پہ ہے دعوائے عظیم

جب پڑھاتا ہے تو کرتا ہے سلف پر ایراد
انکے دعوے نہیں کرتا کسی صورت تسلیم

بولا بقراط کہ بچوں کا پڑھانا ہے عبث
جب یہ حالت ہے تو خود کو نہ دیجے تعلیم

الّو اور حضرت سلیمانؑ کا مکالمہ

الّو سے سلیماں نے اک روز یہ پوچھا
کھیتوں میں تو کس وجہ سے دانہ نہیں کھاتا

الّو نے کہا ڈرتا ہوں اے حضرتِ والا
جنت سے اسی دانہ نے آدم کو نکالا

پوچھا کہ تو ویرانے میں کیوں بیٹھا ہے دن رات
آباد مقاموں کی بری لگتی ہے کیا بات

کہنے لگا یکساں ہیں یہ دنیا کے مُوطن
معمورے بھی ہو جائینگے ویرانے کسی دن

پوچھا کہ تو ویرانے میں کیا کہتا ہے اکثر
جو کچھ ترا مفہوم ہے وہ ہم سے بیاں کر

بولا مری تقریر میں یہ راز نہاں ہے
جو رہتے تھے اِن محلوں میں وہ آج کہاں ہے

پوچھا کہ تو آبادی میں کیوں نہیں آتا
بولا ستم انسان کا دیکھا نہیں جاتا

پوچھا ہمیں سمجھا دے ذرا اسکو وہ کیا ہے
جو کچھ کہ نشیمن میں ترے تیری صدا ہے

بولا کہ نشیمن میں یہ ہے میرا ترنم
چلنا ہے تمھیں غافلو ہشیار رہو تم

لو زادِ سفر ساتھ میں تا حدِ مقدور
بیفکر نہو منزلِ مقصد ہی بہت دور

غمِ ناکام کا غم

رویا ایتھنز کا مشہور مقنن سولن
دل پہ بیٹے کے جو مرنے سے ہوا رنج و محن

کہا اک شخص نے رونے سے نتیجہ کیا ہے
رونے سے مردہ پلٹ کر نہیں آ سکتا ہے

کہا اے بھائی یہی ہے مرے رونے کا سبب
کہ نہیں رونے کا بھی میرے نتیجا کوئی اب

جاہل تنگ وطن ہوتا ہے

سنا یونانی حکیموں سے تھا ایک فریس
رہنے والا صقلیہ کا حکیم اتحریسیں

پوچھا اس سے کوئی یونان کا رہنے والا
کسی صورت سے مگر اس سے وہ مسرور نہوا

ہو معقول تو غصہ کا اٹھا جوش و خروش
بولا جھنجھلا کے کہ اے اسکی سمجھ وہ نادان خاموش

مجھ سے رتبہ ترا زیادہ نہیں ہے بالا
تو ہی سسلی کا ہے یونان کا رہنے والا

سنکے اس طعنۂ دلدوز کو بولا وہ حکیم
آپ جو کہتے ہیں وہ بات ہے مجھ کو تسلیم

فرق یہ ہی کہ مرا ننگ ہے میرا مسکن
آپکی ذات مقدس ہی مگر ننگ وطن

دولت محفوظ علم ہی

جب دشمنوں نے کرکے یورش آکی دفعتاً
اک دم محاصرہ کیا بایس کے شہر کا

ہر شخص مضطرب ہوا اس گیر و دار سے
گزرا ہر ایک دل پہ قیامت کا ماجرا

کر کرکے جمع دولت و مال و متاع کو
لوگوں نے اپنی اپنی بغل میں چھپا لیا

بایس کو کچھ نہیں تھا مگر اس کے اضطراب
جسطرح مطمئن تھا اسی طرح سے رہا

اسطرح سے مگر اسے بیٹھا دیکھ کر
اک دوست سے رہا نہ گیا اور یہ کہا

بایس تم ایسی شان سے بیٹھے ہو آج بھی
جیسے کوئی ہوا ہی نہیں تازہ واقعہ

حالت تمھاری دیکھکے حیرت ہوئی مجھے
کچھ فکر جان کی ہی نہ کچھ خوف مال کا

مال و متاع کیا ہوا مجھکو بتاؤ تو
کچھ بھی نہیں تھا یا کہیں تمنے چھپا دیا

جب پوچھ چکا تمام نصائح کو دوست کی
اکبار ہنس کے دوست نے بات اُس نے یہ کہا

میرا متاع و مال فقط میرا علم ہی
سو اُسکو میں دماغ میں محفوظ کر چکا

ملبوس غیر موزوں

دیکھا فیثا غورث نے اک شخص کو
جسکی تھی پوشاک بیحد خوشنما

جب مگر کچھ گفتگو کرتا تھا وہ
تو غلط جملے بہت سے بولتا

دیکھ کر یہ حال فیثا غورث نے
کان میں اُس شخص کے جھک کر کہا

یا تو اپنی گفتگو کر لو درست
یا ابھی جا کر اُتارو یہ قبا

زندوں کے حقوق مُردوں سے زیادہ ہیں

کنگ سے پوچھا طریقہ خدمتِ ارواح کا
کنگ نے بات سُنکر ہنسکے سائل سے کہا

جبکہ زندوں ہی کی خدمت کر نہیں سکتے ہو تم
مُردوں کی خدمت سے ہوگا تمکو پھر کیا فائدہ

پوچھا اُسنے یہ بتا دو موت میں کیا راز ہے
بولا پہلے زندگی کے راز کو سمجھو ذرا

احسان کا بدلہ احسان ہے

پوچھا کسی شاعر سے کہ اے مرزبان کار
کبتک تو رہیگا یونہی قادروں کا ثناگر

بولا کہ وہ احسان کئے جائیگا جبتک
میں مدح کئے جاؤنگا قادروں کی برابر

جواب خود ستائی

کہیں سیمونیڈس سے اک پہلواں
جتانے لگا اپنی شہزوریاں

کہ دنیا میں ثانی رستم ہوں میں
نہیں مجھ سے بڑھ کر کوئی پہلواں

حریفوں پہ غالب رہا میں مدام
ہمیشہ ہوئے میرے جوہر عیاں

وہ پچھڑا جو مجھ سے مقابل ہوا
کئے کرنیوالوں نے لاکھ امتحاں

سنی جبکہ اسکی یہ لاف و گزاف
کہا سیمونیڈس نے اے مہرباں

جنھیں معرکوں میں کیا تم نے زیر
توانا تھے وہ تم سے یا ناتواں

برابر تھے یا تمسے طاقت میں وہ
کرو صاف صاف اسکو مجھسے بیاں

کئے سیمونیڈس نے جب یہ سوال
تو بیساختہ بولا وہ پہلوان

کہ تھے مجھسے طاقت میں سب دو چند
میں ہر اک طرح انسے تھا ناتواں

کہا کب یہ ممکن ہے اے بھائی جان
کہ ڈنک دیدے شہزور کو ناتوان

کہا خیر میری برابر تو تھے
پچھاڑا ہے جس نے جنھیں بے گماں

کہا سیمونیڈس نے ممکن نہیں
کہ ہمسر سے ہمسر کو پہونچے زیاں

یہ سنکر ہوا پہلوان لاجواب
کہا مجھ سے طاقت میں کم تھے وہ ہاں

کہا پھر یہ شیخی کی کیا بات ہے
جو کمزور کچھ تم سے پچھڑے میاں

مملکت سے پاس قوم زیادہ بہتر ہے

لکھا حریف کو یہ اردشیر بہمن نے
جو مانو ہم کو تو ہم تم کو بخشدیں یونان

جو تم ہمیشہ ہمارے مطیع ہو کے رہو
تو فائدہ ہو تمھیں اور ہمیں ہو اطمینان

لکھا حریف نے اسکو جواب میں کہ جناب
حقیقی فائدہ سمجھے اگر کہیں انسان

نہ دیکھے ملک کو غیر ونکی آنکھ بھر کے کبھی
کسی طرح نہ پہونچائے غیر کو نقصان

عدو کو فائدہ پہونچانے کیلئے بجوف
بجائے اسکے کہ ملجاؤں اپنے دشمن سے
بجائے اسکے کہ حاکم ہوں قوم پر ابہی

خوشی کیساتھا کرے اپنے فائدے قربان
میں لڑکے مرنیکو سمجھا ہوں جنگ میں آسان
زیادہ خوش ہوں میں آزاد ہو اگر نادان

اوصاف دولت

تھا ایک بزم میں حاضر حکیم فیثاغورث
مبالغے سے لیا کام اسقدر انہیں
کہا حکیم نے اس سے کہ جو میں کہتا ہوں

کسی نے دولت دنیا کے کچھ کئے اوصاف
کہ ناگوار ہوئی سب کو اسکی لاف و گزاف
خصوصاً اسکو سنیں اور کریں ذرا انصاف

جو گھر میں بخل سے ٹھہری سخا سے ضایع ہو
وہ حیف قابل تعریف کیا قصور معاف

فرق علم و دولت

پوچھا فیثاغورث نے اک دن اسکا کیا سبب — جاتے ہیں منعم کے در پر عالمان ذی ہنر

در پہ عالم کے مگر منعم نہیں آتا کوئی — سنکے اس قضیہ کو بولا وہ حکیم خوش سیر

فائدے دولت کے عالم جانتا ہی مو بمو — فائدے سے علم کے منعم نہیں رکھتا خبر

بے تعلقی موجب امن ہی

کہا فیثاغورث نے وہ آدمی — جو نیکی کرے کچھ نہ کوئی بدی

وہ دنیا میں دشمن سے محفوظ ہی — کہ ہر نیک و بد اُس سے محفوظ ہی

تلاش زر

کسی حکیم نے یونان میں تھا جسکا وطن — کسی غریب کی شادی اپنی دختر کی

کسی نے اُسپہ کیا اعتراض اور یہ کہا
کہ چاہیے تھی تلاش آپ کو تونگری
دیا حکیم نے اُسکو جواب یہ فوراً
کہ قدر میری نظر میں ہے صرف جوہر کی
پس ایسے زر سے کسی شخص کی ہو جسکو تلاش
وہ شخص اچھا ہے جسکو تلاش ہو زر کی

قرب و بُعد

کسی حکیم کو اہل وطن کے ظلموں نے
کیا وطن سے نکلنے کیواسطے مجبور
کہا حکیم نے رہنے دو مجھکو پاس اپنے
کہ میں قریب بھی رہکر ہوں تم سے کوسوں دور

فوائد عدم تعلق

کوئی حکیم کسی شخص سے گیا ملنے
مگر وہاں اُسے دربان سے ملا یہ جواب
کہ آج مل نہیں سکتے یہ غور کرتے ہیں
کہ کیسے لوگوں کو سمجھائیں [illegible]

کہا یہ غور کرے کاش وہ کہ بعد اسکے ‏— کبھی کسی کو نہ دینا پڑے حساب کتاب

تعلیمِ قناعت

بیٹھا تھا سقراط اک موچی کی دکاں پہ کہیں ‏— تشنگی سے تھا مگر وہ کفش گر کچھ بدحواس

اپنے لڑکے سے کہا اُسنے کہ ہمسایہ سے قرض ‏— کل کے وعدے پہ شراب اسوقت لے آ اک گلاس

بولا سقراط اس سے یہ بہتر کہ اپنے نفس سے ‏— کہدے تو اسوقت پانی سے بجھا اپنی پیاس

اچھی چیز تعریف سے مستغنی ہے

کی تھی سقراط نے اک مرتبہ تقریر کہیں ‏— حکمت و وعظ و نصیحت پہ جو مبنی تھی تمام

دی کسی شخص نے آکر خبر اُسکی بابت ‏— کہ نہیں کرتا پسند اُسکو کہیں مجمع عام

کہا تقریر جو حق پہ ہے تو کیا غم ہے مجھے ‏— ناپسندیدہ بتاتے ہیں اگر اُسکو عوام

خیالاتِ حکیمانہ ہر حالت میں قائم رہتے ہیں

کہتے ہیں لوگ کہ سقراط کی بیوی تھی بہت
وہ اخلاق کہ دنیا میں تھا اُسکا جواب
لڑکے اور چیخ کے ایک مرتبہ اس ظالم نے
اسپہ سقراط نے ہنسکر یہ متانت سے کہا

تند خو خانہ برانداز دنی زشت عمل
وہ خطاکار کہ عالم میں تھا اُسکا بدل
پھینکی سقراط پہ پانی کی بھری اک چھاگل
کہ گرج کر بھی برس جاتے ہیں اکثر بادل

عروج وزوال کی حدیں

شہر میں سقراط کی تھا اک رئیسِ نوجواں
ایکدن سقراط سے کہنے لگا از راہِ طنز
ایسے ایسے لوگ رہے ہیں ہماری قوم میں

جو بد اخلاقی کی اندر آپ تھا اپنی مثال
مدتوں سے ہے ہماری قوم میں علم و کمال
آپکے اسلاف میں ڈھونڈیں تو ملنا ہے محال

سنکے یہ باتیں کہا سقراط نے سنیئے جناب | پہلے کچھ بھی ہو مگر اب مجھکو ہے یہ احتمال

مجھسے میری قوم میں ہوتا ہے آغاز عروج | آپ پر اُس عزت قومی کی ہے حد زوال

دیگراں را نصیحت خود را فضیحت

تھا اتفاق سے مہمان ایک دن سقراط | کسی عزیز کے یا اپنے دوست کے گھر پر

ہوئی جو کھانیکے لانے میں دیر نوکر کو | تو میزبان ہوا اس بات سے خفا اُس پر

یہ چاہتا تھا کہ دے اس خطا کی اُسکو سزا | کہ اُسکو روک دیا یہ حکیم نے کہہ کر

جو اُسکے نفس سے تم دُور کرتے ہو فساد | تو اپنا نفس نہ ڈالو فساد کے اندر

چغلخور اصل دشمن ہے

کسی نے کہا آکے سُقراط سے | کہ دیتا تھا تجھکو فلاں گالیاں

کہا اُسنے در پردہ کی تھی بدی — مگر مجھ سے تم کرتے ہو بیاں

تبدیل پیشہ سے دماغ نہیں بدلتا

پہلواں تھا کوئی یونان میں مشہور مگر — فنِ کشتی میں نہ تھا اصلا کچھ اسکو شعور

لڑکے دشمن سے نہوتا تھا ظفریاب کبھی — بلکہ اکثر وہ پچھڑ جاتا تھا حریفوں کے حضور

عاجز آیا تو کیا پیشہ طبابت کا شروع — اور اس کام میں کی مشق بحدِ مقدور

ایک دن دیکھکے سُقراط نے اسکو یہ کہا — اب تم آئندہ سے لوگوں کو پچھاڑو گے ضرور

کن علوم کی تعلیم ضروری ہے

سقراط سے کہا کہ وہ باتیں بتائیے — جن سے کہ نوجوانوں کا ہو قلب مستنیر

سُقراط نے کہا کہ جوانوں کیواسطے — جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ ہے بہترین مشیر

لازم ہیں ایسی باتیں جوانوں کو سیکھنا | جنکے نہ سیکھنے سے پشیماں ہوے ہیں ...

بیگناہ مرنا گنہگار مرنے سے اچھا ہی

جب حکومت نے دیا زہر کا سقراط کو جام | اسکی بیوی نے کیا شور و بکا نالہ و آ...
پوچھا سقراط نے کس بات پہ روتی ہے تو | روکے کس غم میں کئے لیتی ہے تو حال تبا...
بولی اس بات پہ رونا مجھے آتا ہے کہ آج | بیگنہ تجھ کو ستاتے ہیں سب سینہ سیا...
بولا سقراط کہ اے عقل کی دشمن عورت | کیا یہ خواہش ہے کہ ثابت ہو مرا کوئی گنا...

بڑھاپے میں علم سیکھنا بڑھاپے مین جاہل رہنے سے بہتر ہے

کی تھی سقراط نے پیری میں توجہ مبذول | کسب اسرار و رموز فن موسیقی پہ ...

محو تھا پڑھنے میں اس علم کے اک دن حکیم
طنز یہ کہنے لگا کوئی یہ اُس سے آ کر

کہ تجھے شرم نہیں آتی ہے اے پیر خرف
سیکھتا ہے جو بڑھاپے میں تو یہ علم و ہنر

سنکے بقراط یہ کہنے لگا جاہل رہنا
شرمناک اس سے زیادہ ہے بڑھاپے میں مگر

موت سے زیادہ زندگی دشوار ہے

یہ سقراط سے پوچھا اک شخص نے
کہ دشوار ہے موت سے کون چیز

کہا جس کو کہتے ہیں سب زندگی
وہ ہے موت سے سخت تر اے عزیز

سمجھنے والا ایک کافی ہے

فلاطوں کے شاگرد سب ایک بار
ہوئے جمع جب بہر اصلاح کار

تو ان سب میں شامل ارسطو نہ تھا
فلاطوں کا دل اس سے تھا کُندہ سا

اسی وجہ سے کچھ وہ خاموش تھا
تو سب پڑھنے والوں میں اک جوش تھا

بالآخر فلاطوں سے سب نے کہا
کہ تقریر کی کیجئے ابتدا

کہا سننے والا نہیں کوئی بھی
تو پھر کیا ضرورت ہے تقریر کی

یہ سنتے ہی سب بول اٹھے ایکبار
کہ ہیں سننے والے یہاں ہشیار

کہا اُسنے بیکار ہیں بیشمار
فقط ایک ہو جو ہو مثل ہزار

حاسد کو نقصان پہونچانے کا طریقہ

فلاطوں سے پوچھا کسی شخص نے
کہ حاسد کو پہونچائیں کیونکر گزند

کہا اُس کی یہ سہل ترکیب ہے
کہ تم خوبیاں اپنی کرلو دوچند

تونگری کی موت مفلسی کی زندگی سے اچھی ہے

پوچھا افلاطوں سے لوگوں نے کہ اسکا کیا سبب
جمع کرتا رہتا ہے پیری میں بھی مال آدمی

فکر دولت میں ہے یاں تک رہتی ہے مصروفیت
اس سے مرتے مرتے بھی فرصت نہیں پاتا کبھی

بولا افلاطوں کہ مرنا جمع کر کے مال و زر
اس سے بہتر ہے کہ کاٹے مفلسی میں زندگی

علم اور دولت کا اجتماع محال ہے

پوچھا افلاطوں سے لوگوں نے کہ کیا بات ہے
جمع اک جا کیوں نہیں ہوتے کبھی مال اور کمال

بولا افلاطوں کہ دونوں کیسے ہو سکتے ہیں جمع
جبکہ رتبہ میں کمال و علم سے کمتر ہے مال

گناہ بدصورتی میں اضافہ کرتے ہیں

بزم افلاطون میں نیکوں اور بدوں کا ذکر تھا
سُن کے اسکو بول اٹھا وہ حکیم باصفا

ہو گنہ پر نفس آمادہ اگر انسان کا
تو یہ لازم ہے کہ دیکھے وہ اٹھا کر آئینا

اپنی صورت جب نظر آئے تو اندازہ کرے
بدنما ہے دیکھنے میں یا وہ صورت خوشنما

صورت اچھی ہو تو پھر یہ غور کرنا چاہیے
کیوں بناؤں اچھی صورت کو گناہوں سے برا

اور بری صورت ہو تو سوچے ذرا دلمیں وہ شخص
بد کو بدتر شے بنا دینے سے ہے کیا فائدا

جاہل کی تعریف بھی مذمّت ہے

اتفاقاً ایکدن کوئی رئیس نیکدل
اک ضرورت کیلئے افلاطون سے ملنے گیا

باتیں کرتے کرتے ذکر آیا تو بولا وہ رئیس
کل فلاں جاہل نے کی تھی آپکی مدح و ثنا

[illegible] علم ہو گیا [illegible] تھا میں [illegible] آپکی — جبکہ جاہل بھی ہو مداح و ثناگر آپکا

سنکے یہ بات افلاطون [illegible] — اور اسکے بعد پھر بیساختہ رونے لگا

دیکھ کر حال حزیں کا وہ رئیس نیکذات — اور پھر افلاطون سے پوچھا کہ کیا صدمہ ہوا

آپ کو اچھی سنائی تھی خبر میں نے مگر — اتفاقاً آپ پر اسکا اثر الٹا پڑا

بولا افلاطوں یہ پوچھو مرے رونیکا سبب — میری ہر امید پر اسوقت پانی پھر گیا

آج سمجھا ہوں کہ ہوں اتبک صد جہل میں — ورنہ اس جاہل کو بھاتی کیوں مری گویائی دا

غیبت کی فرصت عقلمندوں کو نہیں ہوتی

ایک ظالم سے خفا ہو کے چلا افلاطوں — پیشتر اسکے بہت گرم تھی جس سے صحبت

جب چلا تو یہ کہا اس سے اس ظالم نے — آج احباب سے تم میری کروگے غیبت

سنکے از راہ متانت یہ فلاطوں نے کہا — سیکڑوں کام ہیں اسکی نہیں مجھکو فرصت

نقل اصل سے بہتر نہیں ہو سکتی

کہا ایک عاقل سے اک دن کسی نے
کہ چلیئے مرے ساتھ اگر بے تامل

تو اُس شخص سے آپکو میں ملاؤں
کہ جو نقل کرتا ہے بلبل کی بالکل

کہا اس سے ملنے میں کیا فائدہ ہے
مرے پاس موجود ہے اصل بلبل

بچوں کو کیا علم سکھانا چاہیئے

کسی حکیم سے اک شخص نے سوال کیا
کہ چھوٹے بچوں کو کیا کیا سکھائیں علم و ہنر

کہا حکیم نے یہ بات صاف ہے صاحب
وہی سکھائیے کام آئے جو جوان ہو کر

حدود مملکت

پوچھا اجیسلاس سے سائل نے ایک روز
اسپارٹا کی حدّ معیّن کہاں پہ ہے
اسنے دیا جواب کہ ہر مملکت کی حد
فرمانروائے عہد کی نوک سناں پہ ہے

کارنامہ خود ایک یادگار ہے

اجیسلاس نے احباب کو وصیّت کی
کہ یادگار بنانا نہ کوئی تم میری
یہ بات سُنکے جو لوگوں نے کچھ سبب پوچھا
اجیسلاس نے اُن سب کو یہ جواب دیا
کیا ہے عمر میں گر میں نے نیک کام کوئی
تو بعد مرنیکے وہ خود ہے یادگار مری

اگر گزارے ہیں بے صرفہ میں نے لیل و نہار
تو یادگار ہے میری جہاں میں بیکار

تادیب نفس

بقراط کے شاگردوں نے اک روز یہ سوچا
اُستاد کی حالت کا کچھ اندازہ کریں ہم

دیکھیں کہ جو کہتا ہے یہ باتیں ہیں زبانی
یا قول پہ رکھتا ہے عمل کو وہ مقدّم

یہ سوچ کے بقراط کی تصویر اُٹھائی
اور ملکے گئے پاس فلیموں کے باہم

اس شخص کو تھا علم قیافہ میں بڑا دخل
تھا رازِ درون کا یہ ہر اک شخص کے محرم

بقراط کی تصویر جو دیکھی تو یہ بولا
بدکاری کا شائق ہے بلا شبہ یہ مُجرم

بقراط کے شاگرد یہ سنکر ہوئے ناراض
اور بولے کہ یہ بات نمانیں گے کبھی ہم

بقراط کی تصویر ہے یہ تم نے جو دیکھی
حکمت میں جسے کہتے ہیں سب قائدِ اعظم

یہ بات سنی جب تو فلیموں یہ بولا
جو بات میں کہتا ہوں زیادہ ہے نہ وہ کم

بقراط کو تم جاکے سناؤ میری رائے
پھر دیکھو کہ کیا کہتا ہے وہ پیر معظم

شاگردوں نے جاکر جو سنایا اُسے یہ حال — اُن سب سے یہ کہنے لگا وہ مرجع عالم

بدکاری کا شایق ہی بہت نفس ہمارا — رکھتا ہی بُری باتوں کا یہ قصد مصمم

جنبش نہیں کر سکتا ہو لیکن کسی جانب — اِسطرح دبائے ہوئے رکھتے ہیں اُسے ہم

دیوانہ کا گھر

ایک دیوانے سے لوگوں نے یہ پوچھا اکروز — کہ کہاں رات کے وقت آج کریگا آرام

اُسنے ہنسکر یہ دیا پوچھنے والوں کو جواب — وہیں سو جاؤنگا مجھکو جہاں ہو جائیگی شام

حسن ظاہر کوئی چیز نہیں ہی

دیکھی اک عورت کسی بقراط کے شاگردوں نے — جو نہایت ہی حسین تھی و نہایت ہی جمیل

دیکھکر شخص اُسکو محو حیرت ہو گیا — اتنے میں کہنے لگا اُس سے یہ بقراط عقیل

کیا سبب ہے اسکو تم کیوں گھورتے ہو اسقدر
بولا تم دیکھو جو اسکی اندرونی سطح کو

وہ یہ بولا دیکھتا ہوں صنعتِ ربِّ جلیل
تو نظر آئے تمھیں پھر وہ نہایت ہی ذلیل

مشتے نمونہ خروارے

سرِ عدالت مقدّمہ بجاہ و جلال
کہ ایک حاکم اعلےٰ وہاں ہوا حاضر
جب اسکی ریش مخضب کو شاہ نے دیکھا
یہ کہہ کے شاہ نے دیا اُسکو حکم موقوفی

سریرِ عدل پہ وہ تق فزا تھا فیلاتوس
بڑھا وہ شاہ کی جانب بحسرت یا بوس
تو اسکے دل میں ہوا ایک درد سا محسوس
کہ راستبازی سے تیری میں ہو گیا مایوس

جب اپنے بالوں سے دیتا ہے تو دغا سب کو
تو اور کاموں میں بھی ہو گا مایل سالوس

حرص کا مضحکہ

سنتے ہیں اکبار شاہ فیلقوس — ہوگیا زخم گلو میں مبتلا

تھا وہاں پر ایک جرّاح حریص — کر رہا تھا وہ علاج اس زخم کا

شاہ سے وہ احمق اس دوران میں — روز فرمائش نئی کرتا رہا

لالچی تھا چونکہ بے حد و حساب — دھوکے دے دیکے بہت کچھ اینٹھتا

فیلقوس اک دن کسی درخواست پر — ہنس دیا اور ہنس کے یہ کہنے لگا

تم کو جو لینا ہو لے لو آج کل — ہے تمہارے ہاتھ میں میرا گلا

دیو جانس کا ایک جواب

کسی نے دیو جانس سے یہ پوچھا — کہ کلبی نام کیوں رکھّا تمھارا

کیا بہتر بہی ہو نام میرا
کہ ہے اُسکے مطابق کام میرا

کہ میں نیکوں کی کرتا ہوں خوشامد
اور اُن کو کاٹ لیتا ہوں جو ہیں بد

درویش ہر کجا کہ شب آید سرای اوست

دیو جانس کو یہ عادت پڑی تھی
کہ پھرتا شہر کی گلیوں میں اکثر

کسی نے ایک دن اُس سے یہ پوچھا
کہ اے عاقل حکیم نکتہ پرور

نہیں کیا کوئی تیرا گھر نہیں ہو
کہ لے آرام رہ کر اُسمیں دم بھر

کہا گھر کی اگر تعریف یہ ہے
کہ لوگ آرام پائیں اُس میں رہ کر

تو پھر میں بھی جہاں آرام پاؤں
اُسی کو فرض کر لیجئے مرا گھر

عاقل حرص کا بندہ نہیں ہوتا

بارِ اوّل جو دیو جانس کلبی سے ملا — اپنی اک خاص ضرورت کیلئے اسکندر
ویسے ہی بیٹھا رہا جیسے کہ بیٹھا تھا حکیم — کوئی تعظیم نہ کی شاہ کی اُسنے اُٹھ کر
اِس جسارت پہ سکندر کو بڑا طیش آیا — اور کہا اُس سے یہ بیساختہ برہم ہو کر
تجھ کو کس بات نے مغرور کیا ہے ایسا — کہ تو آداب فراموش ہوا ہے یکسر
سُن کے ارشاد متانت سے دیو جانس نے کہا — میں کروں خادمِ خدام کی عزت کیونکر
اور بھی شاہ کو اِس بات پہ غصّہ آیا — اور کہا کس کا مجھے سمجھا ہے تو نے نوکر
بولا وہ اُس کے بتانے کا ارادہ تو نہ تھا — مگر اب آپ جو سُنتے ہیں تو سنیئے بہتر

حرص و شہوت کو سمجھتا ہوں میں خادم اپنا
آپ اِن سب کے دل و جاں سے ہوئے ہیں چاکر

جواب جاہلاں باشد خموشی

دیوجانس کو رستہ میں کسی دن
بُرا کہتا تھا کوئی بے حمیّت

کبھی دیتا تھا گالی ترش ہو کر
کبھی کرتا تھا وہ اس کو ملامت

مذمت پر مذمت ہو رہی تھی
مگر خاموش تھا وہ نیک سیرت

کوئی بولا کہ اے مرد خردمند
سکوت اس وقت میں ہے اک حماقت

بُرائی آپ بھی کچھ اس کی کیجئے
کہ ہو لوگوں میں خوب اسکی فضیحت

کہا اسکی مذمت پر خموشی
سمجھتا ہوں میں اسکی اک مذمت

مآل اسراف

ایک مسرف نے دیوجانس کلبی سے کہا
کہ مجھے آپ عطا کیجئے من بھر چاندی

ہنسکے مسرف نے کہا اُس سے کہ اے مرد فقیر
تک سمجھ میں نہیں آتی تری فرمایش کی

ایک پیسہ کا جب اوروں سے تو کرتا ہے سوال
مجھ سے کسواسطے چاندی کی طلب ہے اتنی

بولا اسواسطے کرتا ہوں میں تجھ سے یہ سوال
دیکھتا ہوں کہ تنزل پہ ہے دولت تیری

اور لوگوں سے تو ملتا ہی رہے گا پیسہ
تجھ سے لیکن نہ ملیگی کبھی پھر اک کوڑی

حقوق دوستی

دیوجانس نے دو شخصوں کو دیکھا
کہ باتیں کر رہے تھے دونوں ملکر

نمایاں تھا مگر اخلاص اتنا
کہ دونوں ہو رہے تھے شیر و شکر

پھٹے حالوں تھا اسمیں ایک سید
مگر تھا دوسرے کا حال بہتر

دیوجانس نے پوچھا کون ہیں یہ
کہ ہیں اسطرح سے اخلاص پرور

کوئی بولا کہ ہیں یہ دوست ایسے
کہ ہیں بیشبہ یک جان و دو پیکر

کہا جب دوست ہیں تو کیا سبب ہے | گر اک مفلس ہم انہیں اک تونگر

غرور کے انداز جُدا جُدا ہیں

جلسہ کیا تھا کوئی فلاطوں نے ایکدن | مدعو تھے جسمیں شہر کے سب صاحب کمال

آیا جو بزم میں دیوجانس تو اسطرح | کیچڑ بھری تھی پاؤں میں سر پر تھے بکھرے بال

آتے ہی دونوں پاؤں جو قالین پر ملے | تو فرش کو بنا دیا یکسر خراب حال

رگڑا کیا جو پاؤں اسطرح دیر تک | تو حاضرین بزم نے اس سے کیا سوال

کیا کر رہا ہے اے دیوجانس یہ حرکتیں | محفل کا تجھ کو پاس نہ تہذیب کا خیال

اُسنے دیا جواب کہ تلووں سے پاؤں کے | کرتا ہوں میں غرور فلاطوں کو پائمال

سنکر یہ بات اسکی فلاطوں ہنسا مگر | ہنسنے کے بعد کہنے لگا وہ خجستہ فال

کرتا ہے پائمال یہ بیشک غرور کو | لیکن بڑے غرور سے کرتا ہے پائمال

تبدیل پیشہ عقل کو نہیں بدلتا

اک مصور نے کیا پیشہ طبابت کا شروع
خردہ گیری سے زمانہ کی جو عاجز آ گیا

ایکدن اپنے مطب میں تھا وہ مصروف علاج
دیکھ کر اسکو دیوجانس کلبی نے کہا

آپکی فہم و فراست کے ہوئے ہم قائل
چھوڑ دی آپ نے تصویر کشی خوب کیا

کیونکہ تصویر بتاتی ہے مصور کے عیوب
قبر کی خاک چھپاتی ہے طبیبوں کی خطا

انسان کے عیب خدا ہی خوب جانتا ہے

غصہ کے جوش میں اک روز سر راہگذر
دیوجانس کو برا کہنے لگا کوئی لئیم

پہلے ہر بات بہت صبر و تحمل سے سنی
پھر نہایت ہی متانت سے یہ بولا وہ حکیم

تم کو معلوم نہیں ہیں مرے عیب ابھی
جانتا ہوں جنھیں میں اور خداوند علیم

قناعت اور آزادی سب سے بڑی دولت

ایک دن کوئی دیو جانس سے یہ کہنے لگا
آج دُنیا میں شہِ ایران کا ثانی نہیں
اُس سے بڑھ کر کوئی دُنیا میں نہیں ہے خوش نصیب
اُس کو لاکھوں عشرتیں ہیں اور غم کوئی نہیں
جب دیو جانس سب اُسکی سُن چکا لاف و گزاف
ہنس کے بولا آپ جو کہتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں
مجھ سے اچھی شاہ ایراں کی نہیں ہے زندگی
جو مری حالت ہے ہرگز آج وہ اُسکی نہیں
اصل میں دُنیا میں ساری برکتیں نیّت کی ہیں

کوئی شے اچھی نہیں نیت اگر اچھی نہیں

اِس طرف ہی صبر و عُسرت لیکن آزادی کیساتھ

اُس طرف ہی حرص و عشرت لیکن آزادی نہیں

اِس طرف سامان ناکافی ہی کافی ہے مگر

اُس طرف سامان کافی ہی مگر کافی نہیں

آزاد زندگی غلامی سے بہتر ہی

ساگ دھوتا تھا کہیں بیٹھ کے اک دن سقراط

تاکہ تیار کرے شام کے کھانے کو غذا

اتنے میں گزرا اُدھر سے کوئی شاہی افسر

ہنسکے سقراط سے ازراہ تمسخر یہ کہا

خدمت شاہ میں رہتا تو اگر اے سقراط

تو یقیں یہ ہی کہ محتاج نہ ہوتا اتنا

کچھ نہیں پاس ترے کھانے پہننے کیلئے

کبھی بھوکا تجھے پاتے ہیں کبھی ہم ننگا

اسی صورت سے دیئے سیکڑوں طعنے اُسنے
سنکے سقراط نے ان سب کو بالآخر یہ کہا

سنئے جو مجھ سی کہیں مینے سنیں وہ باتیں
اب جو میں کہتا ہوں تم اُن کو سنو دل سے ذرا

ساگ پر میری طرح تم جو قناعت کرتے
تو غلامی کا نہوتا یہ کمر میں پٹکا

من ضحک ضحک

ایکدن آکے کسی نے دیوجانس سے کہا
لوگ اُڑاتے ہیں ہنسی اے دیوجانس تری

دیوجانس نے دیا اُسکو متانت سے جواب
جو اُڑاتے ہیں ہنسی انکی ہی اُڑتی ہے ہنسی

خدا کی بھیجی ہوئی مصیبت سب سے زیادہ سخت ہے

دیوجانس اک بار بیمار تھا کچھ
کہ لوگ آئے ملنے کو بہر عیادت

کسی نے کہا اتنا گھبراتے کیوں ہو
کہ ہو یہ خدا کی طرف سے مصیبت

وہ بولا تمھارا اگر قول سچ ہے
تو گھبرانے کی ہے زیادہ ضرورت

معتبر لوگ کسی کی بدی نہیں کرتے

تھا بیٹھا ملول ارسطو سے اکدن افلاطوں
تو بات بات سے بو آ رہی تھی رنجش کی

یہ حال دیکھ کے استاد کا ارسطو نے
بصد ادب کیا دریافت باعث خفگی

کہا فلاں نے جو ہے معتبر مرے نزدیک
سنی ہیں آج بہت سی برائیاں تیری

ارسطو اسپہ یہ کہنے لگا کہ اے استاد
جو معتبر ہیں وہ کرتے نہیں کسی کی بدی

زیادہ گوئی کا نتیجہ

کیں ارسطو سے کسی شخص نے اتنی باتیں
کہ طوالت سے وہ تقریر کی گھبرا اٹھا

جب ذرا وہ ہوا خاموش بامید جواب
تو ارسطو نے نہایت ہی متانت سے کہا

پہلا حصہ تری تقریر کا اب یاد نہیں
کیونکہ جب وقت سنا تھا اُسے عرصہ گزرا

آخری حصۂ تقریر جو مستحضر ہے
چونکہ ناقص ہے وہ مشکل ہے سمجھ میں آنا

مخلوق سے خالق کا پتا ملتا ہے

اک مناظر نے سرِ بزم ارسطو سے کہا
آپ کیا رکھتے ہیں ہستی خدا پر برہان

اُس نے برجستہ دیا پوچھنے والے کو جواب
خلق سے بڑھ کے نہیں ہستی خالق کا نشاں

علم سیکھنے کی محنت گوارا کرو یا جہالت کی مصیبت برداشت کرو

حلقۂ درس میں شامل تھا کوئی طالب علم
اُسکے اچھے نظر آتے نہ تھے لیکن آثار

جبر کھینچا وہ ہوتا تھا شریک تعلیم
علم کا شوق مگر دل میں نہیں تھا زنہار

ایسی جہالت میں جب اُس شخص کو مدت گزری
تو ارسطو نے کہا دیکھ کے اُسکو اک بار

علم کا بوجھ اگر اُٹھ نہیں سکتا تم سے
تو اُٹھاؤ گے جہالت کی اذیت ناچار

عدل شجاعت سے بہتر ہے

سکندر نے اکدن ارسطو سے پوچھا
کہ اے نکتہ رس صاف دل نیک محضر

بھلا بادشاہان عالم کے حق میں
شجاعت مناسب ہے یا عدل بہتر

کہا کیا ضرورت شجاعت کی اسکو
جو اپنی رعایا پہ ہو عدل گستر

سچ سب سے بہتر دوست ہے

کسی نے ارسطو سے اکدن یہ پوچھا
فلاطوں ترا دوست ہے اے خرد ور

تو کیوں بحث کرتا ہے اتنی تو اس سے
کہ حرف اُس سے آتا ہے اس دوستی پر

کہا دوست ہے میرا بیشک فلاطوں — مگر سچ مرا دوست ہے اُس سے بڑھکر

فتح ظاہر و باطن

فتح کرتا تھا کسی ملک کو جب اسکندر — تو ارسطو یہ کہا کرتا تھا اُس سے اکثر

فتح پائی ہے ابھی جسموں پہ تو نے ای شاہ — اب کرو سعی کہ قبضہ ہو دلوں کے اوپر

اُستاد اور باپ کا تقابل

کہا کرتا تھا ندیموں سے سکندر اکثر — باپ سے بڑھکے ہے انساں کا استاد شفیق

باپ لایا ہے اُسے عالم سفلی کی طرف — وہ بتاتا ہے اُسے عالم علوی کی طریق

میں تم نہیں

شاہ اسکندر نے از راہِ کرم
ایک قیدی کو رہائی دی کہیں
کوئی افسر جو وہاں موجود تھا
ہو گیا یہ دیکھ کر چیں بر جبیں،
اور کہا ہوتا اگر میں حکمراں
تو سزا دیدیتا اسکو بالیقیں
بولا اسکندر کہ یہ سچ ہے مگر
چھوڑتا ہوں اسکو میں تم نہیں

اُس جہاں کو بھی ملا لوا اسکے ساتھ

اکدن اسکندر بہت دلتنگ تھا
جب ارسطو نے سبب پوچھا کہا
کیا کہوں میں ہیچ آتا ہے نظر
ہمّت عالی کو میری یہ جہاں
بولا پھر تم غم سے کیوں ملتے ہو ہاتھ
اُس جہاں کو بھی ملا لوا اسکے ساتھ

راستی بیخوف کردیتی ہی

ایک عالم بادشہ کے سامنے　　کہہ رہا تھا صاف باتیں ۔

شاہ نے اُس سے کہا اے بو الفضول　　تیری باتیں سچ تو ہیں پر

لیکن ایسی صاف گوئی پر تجھے　　میرے غصّے کا نہیں ہے خو

بولا میں جھوٹا نہ ظالم بادشاہ　　صاف گوئی سے ہو پھر کیونکر

کارکن سے عہدے کی زینت ہوتی ہی

سکندر نے ناراض ہو کر کسی سے　　نہایت ذلیل اُسکو سونپی تھی

مگر حُسن کیسا تھا اُس نیک دل نے　　وہی خدمت انجام دی ایک

سکندر نے اک روز ہنسکر یہ پوچھا　　کہ اس عُہدے کی تو نے کیا

سنی شاہ کی جب یہ طنزیہ تقریر | دیا یہ جواب اُنسے باصف
کہ عہد سے سوا انساں کی زینت نہیں ہے | مگر اُس سے عہد کی ہو

ثمرۂ احسان

مخبر نے سکندر کو بتایا کہ فلاں شخص | کرتا ہے بہت آپکی لوگو
یہ سن کے سکندر نے جو معلوم کیا حال | پایا اُسے پابستۂ آلا
کچھ گردشِ افلاک تھی کچھ آفتِ افلاس | کچھ در پئے آزار تھے
جب شاہ کو معلوم ہوا حال سب اسکا | کی جانچ اُس شخص کے
بعد اسکے جو معلوم کیا حال کچھ اس کا | پایا اُسے ہر طرح سے

یہ سن کے کہا شاہ نے مخبر سے کہ اے شخص
میری مرے قبضہ میں ہے تعریف و مذمت

شرط انصاف

کسی نے آکے سکندر کے سامنے اک روز
کسی ملازم دیرینہ کی شکایت کی

جو سن چکا تو سکندر نے یہ جواب دیا
ہم ایک شرط سے مانینگے بات کو تیری

کہ ہم سے کچھ وہ کہیگا اگر خلاف ترے
تو اسکی بات بھی پھر مان لینگے ہم سچی

انصاف

کیا اک چور کو حاضر سکندر کی عدالت میں
کیا یہ فیصلہ اُسنے کہ دو بجائے اسے پھانسی

یہ سنکر شاہ سے کہنے لگا وہ چور رو روکر
کہ شاہا میں نے چوری با دل ناخواستہ کی تھی

مری نیت نہیں تھی ارتکاب جرم کی ہرگز
خدا کیواسطے اب عفو کر دیجیے خطا میری

سنا یہ عذر اُسکا تو سکندر نے لکھا فوراً
کہ ہم دیتے ہیں اسکو با دل ناخواستہ پھانسی

آزادیٔ قناعت

دیوجانس سے بولا اسکندر — گر یہاں جو ہو آرزو تیری
دیوجانس نے یہ جواب دیا — ہٹ ذرا دھوپ چھوڑ دے میری

جواب معقول

شاہ اسکندر نے اک دن ازرہِ دل لگی — اپنے بیٹے کو کہیں نائن کا بیٹا کہدیا
سنکے لڑکے نے دیا فوراً اسکندر کو جواب — آپ کو میری ماں نے انتخاب اچھا کیا

باہمی فیصلہ بہتر ہے

دو حکیموں میں کسی بات پہ ہوتا تھا نزاع — دونوں لڑتے ہوئے پہونچے سکندر کے پاس

تو سکندر نے کہا فیصلہ کرلو باہم
دونوں خوش ہو گئے اسطرح سے بے خوف و ہراس

میں اگر فیصلہ کردونگا تمہارا تو ضرور
ایک خوش ہوگا اُسے سنکے مگر ایک اداس

معافی و تلافی

سکندر نے اکبار اک مسخرہ کو
خفا ہو کے اک بات پر دی معافی

ازاں بعد کچھ اسکو انعام دے کر
کہا وہ معافی تھی اور یہ تلافی

نااہلوں کیلئے دوسروں کی برائی رسائی کا ایک ذریعہ ہے

فلاطوں سے پوچھا کہ بزم شہاں میں
کرے کسطرح کوئی پیدا رسائی

کہا اُسنے گر نیک طینت ہو کوئی
تو کرتا رہے وہ برا بر بھلائی

اگر بے ہنر ہو تو لازم ہی اُسکو	کر نیکوں کی کرتا رہی وہ بھلائی

عیب سے آگاہ نہ کرنا خیانت ہے

ایک عاقل کو جو تھا اُس کا وزیر سلطنت
دے دیا اک بار یہ کہہ کر سکندر نے جواب
مُدتوں سے رات دن تم ساتھ رہتے ہو مرے
آج تک لیکن نہ بتلایا کوئی عیب و صواب
آدمی سے ایسی ہوتی ہیں خطائیں سیکڑوں
جن پہ کر سکتے ہیں ارزُوے فراست احتساب
لامحالہ خامشی سے لازم آ جائے وہ سبب
اور اُنھیں دو کا نتیجہ ہو گیا وجہ عتاب

یا نہیں سمجھے خطا کو یا چھپایا آپ نے
ایسی حالت میں نہیں جاہل تو خائن ہیں جناب

باہمی فیصلہ بہتر ہی

کشاکش ہو گئی اک مسئلہ پر دو حکیموں میں
بڑھی یہ بات تو دربار شاہی میں گیا جھگڑا
سکندر نے کہا اُنسے کہ تم خود فیصلہ کرلو
ہمارا فیصلہ دونوں کو راضی کر نہیں سکتا

مردانگی کی سب سے پہلے بادشاہ کو ضرورت ہی

کسی دشمن سے کیا کرتا تھا جب فوج کشی
خود بھی میداں میں جاتا تھا سکندر اکثر
خیر خواہوں نے جو اس بات سے روکا اُسکو
تو سکندر نے اُنھیں روکدیا کہہ کر
تم مری جان بچانے کو لڑو دشمن سے
اور خود میں نہ لڑوں حیف ہی میرے اوپر

غربت لاوری کو نہیں گھٹاتی

اک سپاہی سے ہوا سخت سکندر ناراض
دست بستہ کہا اُس نے کہ اے شاہ جہاں
اُسکے گھوڑے کو جو دیکھا کہ ہے دبلا لنگڑا
ہے میدان میں ثابت قدمی کا آلا

حاکم و محکوم کے کام

کسی شخص نے ایسی تقریر کی
مگر تھا وہ پہنے ہوئے اک لباس
کہا شہ نے جیسی کہ تقریر ہے
جو ثابت ہوئی بزم میں لاجواب
نہایت ذلیل اور نہایت خراب
لباس اپنا ایسا ہی کر انتخاب
کہا اُس نے میں نے کیا ایک کام
کریں دوسرا کام پورا اجناب

صلۂ خیرخواہی

سکندر نے ایرانیوں کی طرف | روانہ کیا تھا کوئی ایلچی
مگر چونکہ تھا وہ بڑا جاں نثار | ہوئی بھیجکر اسکو تشویش سی
کہ ایسا نہ ہو مار ڈالیں اُسے | لہذا مناسب ہوئی واپسی
جو واپس ہوا تو یہ کی اُسنے عرض | کہ شہ نے مجھے کیوں اجازت دی
خدا کی قسم شاہ کے کام میں | مجھے کوئی پروا نہیں جان کی
دیا شاہ نے اُس کو ہنسکر جواب | ترے رُوکنے کا سبب ہے یہی

دھوکا دیکر لڑنا شجاعت کے منافی ہی

دی یہ اک امیر نے سکندر کو صلاح | آکر سن آج کی شب فوج عدو پر شبخوں

سن کے یہ بات مشیروں سے سکندر نے کہا
میری خواہش ہے کہ میں فتح کی جویری تیار کروں

زیب و زینت کو شجاعت سے کوئی واسطہ نہیں

روزِ مصاف لشکر دارا کا ہر سوار
سامان نقرئی و طلائی میں غرق تھا

ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر تھا بیقرار
چھکے چھوٹے تھے فوج سکندر کے خوف سے

دیکھا یہ حال جب تو سکندر نے یہ کہا
اے حملہ آوران و دلیران نامدار

جس فوج میں یہ ناز یہ نعمت یہ عیش ہو
تم ایسی فوج کو نہ کہو فوج زینہار

دنیا کے خردبینوں نے دنیا میں آج تک
دیکھا نہیں ہے عیش شجاعت کو ہمکنار

ہے فتح کی نوید یہ دشمن کی آب و تاب
ہمت کرو بڑھو کرو خوف زینہار

اقتضائے ہمّت

سکندر نے کیں جب فتوحات پیہم
تو دارا نے ڈر کر سکندر کو لکھّا

کہ اب بھی اگر ہمسے تم صلح کرلو
تو دیدیں خوشی سے تمھیں کچھ علاقا

مشیر اس پہ راضی ہوئے اور یہ بولے
کہ شاہا مناسب ہے اب صلح کرنا

سکندر نے انسے کہا یہ کہ بیشک
سکندر نہ ہوتا تو میں صلح کرتا

منظر عبرت

دیکھا گورستان میں اسکندر نے اک شہزادہ کو
پوچھا کیا دیکھا یہاں پہ تو نے کہہ اے عزیز

وہ یہ بولا چاہتا ہوں میں نہیں ہوتی مگر
ہڈیوں میں بادشاہوں اور غلاموں کی تمیز

لیاقت شاہی

پوچھا یہ سکندر سے دم نزع کسی نے
بعد آپکے کس شخص کو ہم شاہ بنائیں
بولا کہ وہی قابل شاہی ہی یقینی
جس شخص میں موجود ہوں شاہانہ ادائیں

کسی کو ہمراز نہ بنانا چاہیے

اک راز بتایا تھا سکندر نے کسی کو
اُس شخص نے اوروں کو بھی وہ راز بتایا
جسوقت سکندر یہ ہوئی بات ظاہر
دربار میں اُس شخص کو خود ہی بُلایا
پُوچھا کہ بتاؤ تمھیں کیا اسکی سزا دیں
کیوں تمنے ہر اک شخص کو ہمراز بنایا

وہ بُولا کہ اے شاہ اُسے کیوں میں چھپاتا
جس راز کو خود آپنے مجھ سے نہ چھپایا

اطاعت والدین

مدتوں تک دیس میں اک نوجواں پڑھتا رہا
پڑھ کے گھر آیا تو اسکے باپ نے اس سے کہا

مدتوں تک دیس رہ کر تم نے اے جان پدر
اک ذرا بتلا تو دو سیکھے ہیں کیا علم و ہنر

سنکے یہ لڑکے نے اپنے باپ سے فوراً کہا
میں نے جو سیکھا ہے وہ معلوم سب ہو جائیگا

باپ نے سنکر گستاخانہ لڑکے کا جواب
سخت برہم ہو کے مارا اسکو از روئے عتاب

سخت اس حال میں اسکو بہت کہتا رہا
سب کو خاموشی سے وہ لڑکا مگر سنتا رہا

باپ جب چپ ہو گیا تو بولا موقع دیکھ کر
اے پدر میں نے جو سیکھا ہے یہی ہے وہ ہنر

حالت غیظ و الم سے گو سراپا جوش ہوں
آپ لیکن مار بھی ڈالیں تو میں خاموش ہوں

صورت سے سیرت پہ کوئی اثر نہیں پڑتا

بیوی کو اک حکیم نے از رہِ ناخوشی
تنگ آکے جوشِ غصہ و غم میں طلاق دی

ناراض ہو کے کہنے لگا اس پر ایک دوست
اچھی نہیں لگی مجھے حرکت یہ آپ کی

بیدرد ہو کے آپ نے کیوں دی اُسے طلاق
حالانکہ وہ حسین و شکیل و جمیل تھی

ہنس کر کہا حکیم نے اے میرے پیارے دوست
جوتی کو میری دیکھ یہ کیا خوب ہے بنی

لیکن خبر نہیں ہے تجھے اسکے باوجود
کس جا ہے اور کہاں ہے یہ پاؤں کاٹتی

خودداری

بلایا شاہ بطلیموس نے دربار میں اک دن
تو اقلیدس نے قاصد کو دیا فوراً جواب اسکا

کہ جو شے میرے گھر تک شاہ کو آنے نہیں دیتی
وہی شے میرے گھر سے روکے ہوئے ہے راستا میرا

استغنا شجاعت کا ایک جزو ہے

دی یہ اکبار مشیروں نے سکندر کو صلاح
کہ بہت عورتیں کر لیجئے حرم میں داخل

تاکہ پیدا ہو بہت آپکی اولادِ سعید
کوئی عاقل کوئی کامل ہو کوئی ہو فاضل

سوچ کر اُنکو دیا شاہ نے برجستہ جواب
ایسی تدبیر کا ہرگز نہیں میں قایل

کبھی مردوں کو جو خاطر میں نہ لایا ہو کبھی
عورتوں پر ہو وہ کسطرح سے آخر مایل

جو کہ مردوں سے کسی شے کا طلبگار نہ ہو
عورتوں سے وہ کہے نفع کوئی کیا حاصل

لات جو مارتے ہیں وہ تو گدھے ہیں اکثر

سو رہا تھا کوئی یونان کا مشہور طبیب
ایک جنگل میں کسی پیڑ کے نیچے جا کر

گو سر راہگذر تو وہ نہیں تھا لیکن
اتفاقاً ہوا اُس سمت سکندر کا گزر

کھولکر آنکھ سکندر پہ نظر کی اُس نے | پھر اسی طرح سے لیٹا رہا بیخوف و خطر
جب اُسے قابلِ تعظیم نہ پایا شہ نے | غصہ کے جوش میں اک پیٹھ پہ ماری ٹھوکر
چونک کر اُسنے کہا کون ہی تو اے ظالم | شاہ نے اسکو بتایا کہ میں ہوں اسکندر
وہ یہ کہنے لگا ممکن ہی سکندر ہو تم | لات جو مارتے ہیں وہ تو گدھے ہیں اکثر

بدوں کو حمایت کی ضرورت ہے

اک شخص جسے لوگ بُرا کہتے تھے اکثر | خاشین نے دربار میں کی اسکی حمایت
اسطرح سے حامی جو بُرے شخص کا پایا | خاشین کو کرنے لگے سب لوگ ملامت
اور متفق اللفظ کہا سب نے یہ اس سے | جو لوگ ہیں بد انکی حمایت ہے حماقت
یہ طعنہ دلدوز بڑھے حد سے جو اپنی | خاشین ہنسا اور کہا ہنس کے کہ حضرت
جو بد ہیں حمایت کی ضرورت ہے انھیں کو | نیکوں کو نہیں کوئی حمایت کی ضرورت

مرنا بھی مفت نصیب نہیں ہوتا

فاتین پہ جب غدر کا الزام لگایا
تجویز ہوا یہ کہ اسے زہر دیا جائے
جلّاد نے جس وقت دیا زہر کا پیالہ
کہنے لگا جلّاد سے دے زہر مجھے اور
جلّاد یہ بولا کہ یہاں زہر نہیں ہے
فاتین نے آہ کی اور ہنس کے یہ بولا

اور قتل پہ آمادہ ہوئی اُسکی حکومت
بہتر ہے یہی قتل کی اس شخص کے صورت
فاتین کو محسوس ہوئی زہر کی کلفت
ہو تاکہ بہت جلد مری ختم مصیبت
بازار سے لادوں جو درم کیجئے عنایت
افسوس کہ مرنے کی بھی لیجاتی ہے قیمت

جواب جاہلاں باشد خموشی

لڑا جاہل کوئی شخص اک دن تو لوگوں نے
کہا اُس سے کہ کہئے آپ بھی کس بات کا غم ہے

کہا سخن نے اُنسے کہ خاموشی ہی بہتر ہے
ہم اُس مجمع میں ہیں جہاں غالب مغلوب بکم ہے

دولت کا خرچ کرنا پیدا کرنے سے زیادہ دشوار ہے

مال کچھ جمع کیا تھا کسی احمق نے کہیں
فخر کرتا تھا وہ اس بات کے اوپر اکثر

جاتا جو بزم میں تو لوگوں سے کہتا کہ جناب
عقل کے زور سے میں نے یہ کمایا ہے زر

ارشمیدس نے سنی ایک دن اُسکی شیخی
تو یہ کہنے لگا اُس شخص سے فوراً ہنسکر

کسب زر میں نہ تھی عقل کی حاجت اتنی
خرچ کیجے تو کھلیں عقل کے پورے جوہر

فاضل ماتحت جاہل افسر

بزرجمہر سے پوچھا یک جماعت نے
کہ کون سب سے زیادہ ہے رحم کے قابل

دیا جواب وہ ماتحت خود جو فاضل ہو
اور اُسکا افسر بالا ہو ضدی و جاہل

دوستی بے ایمانی کیلئے نہیں کیجاتی

کسی حکیم کو اکبار دوست نے اُسکے ۔۔۔ کیا تھا کرنے پہ اک ایسے کام کے مجبور

کہ جس سے اُسکی دیانت پہ حرف آتا تھا ۔۔۔ اور اُس سے ہوتا تھا خارج جہاں میں مشہور

لہذا دوست سے ہنسکر یہ کہدیا اُس نے ۔۔۔ کہوں میں کیا کہ نہ ہوگا وہ کام مجھ سے مقدور

جو مجھ کو دوست بنایا ہے آپ نے اپنا ۔۔۔ تو چور بنانا تجھے کس طرح سے ہو منظور

خوئے بدرا بہانہا بسیار

اک گدا نے ایک بار اک شاہ سے ۔۔۔ التجا کی اور مانگا اک درم

شاہ نے ہنسکر دیا اُس کو جواب ۔۔۔ اک درم ہے میری حیثیت سے کم

وہ گدا بولا کہ دیجئے اک ہزار ۔۔۔ آپکے شایان شاں ہے یہ رقم

شاہ بولا دیں مگر کس طرح دیں
تیری حیثیت سے بڑھ کر تجھ کو ہم

خدا کے یاد کرنے والے دوسروں کو بھول جاتے ہیں

کسی شاہ نے ایک عابد سے پوچھا
کہ ہمکو کبھی یاد کرتے ہو تم بھی
کہا اُسنے جب بھولتا ہوں خدا کو
تو اُس روز تم یاد آتے ہو اکثر

بدنامی کو زیادہ بڑھنے دو

سنتے ہیں کہ اک مرتبہ پیرس میں کسی نے
کی مجمع احباب میں پیرس کی شکایت
پیرس نے سنا جب تو غضب سے یہ پکارا
تجویز کرو اُسکے لئے کوئی عقوبت
سب کہنے لگے شہر بدر اسکو کیا جائے
پیرس نے کہا یہ تو کچھ اچھی نہیں صورت
بہتر ہے کہ پیرس سے نجائے کہیں باہر
محدود رہے تا کہ یہیں تک کی مذمت

عادات کی درستی فطرت کو بھی بدل لیتی ہی

جاتا تھا فلیموں سے ملنے جو کوئی شخص
پہلے وہ قیافہ پہ نظر کرتا تھا اکثر

پاتا تھا قیافہ میں اگر کوئی برائی
تو اُس سے کسی طرح نہ ملتا وہ خرد ور

اک مرتبہ سقراط جو ملنے گیا اُس سے
تو روک دیا حاجبِ در نے اُسے در پر

اور جاکے فلیموں سے کی عرض کہ اک شخص
کچھ باتیں کیا چاہتا ہی آپ سے مل کر

یہ سنکے فلیموں نے غور کر جو جھانکا
اچھے نظر آئے نہیں سقراط کے تیور

سُقراط کا اچھا نہیں پایا جو قیافہ
انکار کیا ملنے سے اس بات کے اوپر

نوکر نے جو سُقراط کو پیغام سُنایا
سُقراط یہ کہنے لگا اس بات پہ ہنس کر

جا اور ابھی جاکے فلیموں سے فوراً
کہہ دے کہ نہیں گرچہ قیافہ مرا بہتر

گو ہوتی ہر صورت سے عیاں میری بُرائی
لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ تو مجھ کو بلا کر

یہ لکھ کہ اخلاق خصائل کی درستی | انسان کی فطرت کو بدلتی ہی کیونکر

علم صرف علم ہی کسطرح سیکھا جاتا ہے

بلا کر پوچھا اقلیدس سے بطلیموس نے اک دن | کہ علم ہندسہ کس طرح آتا ہی آسانی
ارادہ ہی کہ سیکھیں کچھ رموز اس علم کے ہم بھی | بتا کوئی طریقہ جو معمولی سے معمولی
تامل کر کے دم بھر اُس حکیم نیک طینت نے | کہا اس علم تک شاہی سڑک کوئی نہیں جاتی

بیہوش کو سمجھانا بے وقوفی ہی

اک شرابی کو ملامت کر کے کوئی بار بار | اُس سے کہتا تھا کہ تمکو ڈوب مرنا چاہئے
دیکھا اُقلیدس نے تو ناصح سے کہنے لگا | اسکے سمجھانے سے تم کو شرم کرنا چاہئے
شوق سے سمجھاؤ اسکو جو کوئی سمجھے مگر | جو نہ سمجھے اُسکے سمجھانے سے ٹرنا چاہئے

غصہ کو بڑھانا بیکار ہی

کوئی دشمن آکے اقلیدس سے یہ کہنے لگا
بولا اقلیدس کہ کھو دوں تیرا غصہ جب تلک

ترک نہ دوں جبتک تجھے ہی خواب و خور مجھ پر حرام
میں بھی تب تک کر نہیں سکتا ہوں کوئی کام اور

ایجاد کی قدر موجد سے زیادہ کرو

اُس کی اک شکل کی ایجاد میں
اتفاقاً آگئے گھیر دشمنوں نے اسکو جب
ارشمیدس نے کہا سر کاٹ لو میرا مگر

ارشمیدس اپنے گھر میں اکدن مشغول تھا
اور سب نے قصد اُسکے قتل کرنیکا کیا
دائرہ میرا بچا لو بہت کام آئیگا

توہم پرستی قابلِ مضحکہ ہے

اک دوست نے کیٹو سے کہا آ کے یہ اک روز
پہونچے گی ضرور آج مجھے کوئی اذیت
جوتے کو مرے کاٹا ہے چوہے نے سحر آج
یہ فال ہے بد اس سے ہے دل پر مرے ہیبت
کیٹو نے کہا یہ تو ہوا کرتا ہے اکثر
جوتہ اسے کاٹے تو ہے البتہ مصیبت

رندی و خراباتی در عہدِ شباب اولیٰ

کہا اک روز ارسطو نے کسی عیاش بڈھے سے
کہ عیاشی میں کیوں بیکار اپنی عمر کھوتا ہے
کیوں عیبوں پہ عیبوں کا اضافہ کر رہا ہے تو
ارے ظالم بڑھاپا خود سراپا عیب ہوتا ہے

بخیل مسرف سے اچھا ہے

کسی بخیل پہ ہنستا تھا اُسکا دوست کوئی
جو اک حکیم نے دیکھا تو یہ کہا اُس سے
بجائے بخل کے اسراف وہ اگر کرتا
بجائے ہنسنے کے حالت پہ اسکی تم روتے

ظلم کا انتقام ضرور لیا جاتا ہے

رئیسوں میں تھا بڑا ظالم کوئی فرماں روا
خون سے ہر دم بھری رہتی تھی جسکی آستین
اُس سے بولا ایکدن کوئی حکیم خیرخواہ
جو میں کہتا ہوں سنو اور کرو اسکا یقین
چاہے دنیا بھر کو کر دو قتل جوش قہر میں
مر نہیں سکتا مگر تم سے تمھارا جانشیں،

شکست کینہ کو اور بڑھاتی ہے

سنا گیا ہے کہ اکبار شاہ کیکاؤس
تھا اپنے ایک مخالف سے برسرِ پیکار

کیا غنیم نے دورانِ جنگ میں تحریر
کہ مجھسے لڑنے میں آتی نہیں ہے آپکو عار

وہی ہیں آپ کہ پہلے لڑے تھے جب مجھسے
شکست کھا کے ہوئے تھے بحالِ زار فرار

جو یاد کرتے وہ ذلت وہ شرم و رسوائی
تو آج جنگ نہ کرتے پھر آپ یوں ناچار

کیا جواب میں تحریر شاہ نے اسکو
کہ ہم بھی جنگ و جدل جانتے تھے یوں بیکار

مگر وہ ذلت و خواری جو یاد آئی ہے
اسی سبب سے اٹھائی ہے آج پھر تلوار

جو اپنی حفاظت نہ کر سکے وہ دوسرے کی کیا حفاظت کریگا

شکست کھا کے کوئی قوم اہلِ جرمن سے
علاقہ اپنا تھا جتنا تمام کھو بیٹھی

پھر اُسکے ساحل اور زمین پہ جب ہوئی آباد	تو کی فرانس نے لڑنے کی اُس سے تیاری
سبب جو پوچھا تو لکھا اُسے حکومت نے	کہ تم سے جنگ و جدل کا فقط سبب یہ ہی
کہ جسنے اپنے علاقہ کو ہاتھ سے کھویا	وہ قوم غیر علاقے کو کیا سنبھالے گی

بد طینت کی محبّت اور عداوت یکساں ہے

اک مرد بد اطوار نے یونان میں اکبار	کچھ زہر دیا باپ کو روٹی میں ملا کر
سسُر سے ہوئی اُسکی کسیطرح لڑائی	کر کر کے ملامت یہ کہا اُسنے بگڑ کر
جو لوگ ملامت سے ہماری نہیں ڈرتے	نقصان اُٹھاتے ہیں وہ اشخاص مقرر

سسُر نے کہا سخت ہے گو تیری ملامت
لیکن وہ نہیں ہے تری روٹی کی برابر

کان سننے کیلئے ہیں

خسر کرتا تھا کچھ نصیحت لیکن
سنتا نہ تھا اُسکو ایک مرد گستاخ
خسر نے کہا کہ کیوں نہیں سنتے تم
حالانکہ تمھارے کان میں ہے سوراخ

بڈھوں کی مخالفت قابلِ اعتنا نہیں

نئی کوئی خسرو نے تجویز کی
ہوئی ایک بڈھے کو جو ناگوار
یہاں تک ہوا برہم اُس بات پر
کہ کہنے لگا از رہ انتشار
کہ اے شاہ جبتک کہ میں زندہ ہوں
ہوا ہے نہ ہو کام یہ زینہار
تو خسرو یہ بولا کہ یُونہی سہی
کرینگے تری موت کا انتظار

غفلت کی سزا

دیکھے اسکندر نے شب کو اکبار
پہرہ پر سوتے ہوئے دو پہرہ دار

فرض سے غافل جو یوں پایا انھیں
سوتے سوتے قتل کروایا انھیں

دونوں کے لاشوں کو بے جان چھوڑ کر
چلدیا یہ کہہ کے شاہ نامور

میں نے جس صورت میں دیکھا انھیں
ویسی ہی حالت میں اب چھوڑا انھیں

جان بچی لاکھوں پائے

ایک دن یونان میں اک نائی نے
خط بنایا استلناطونیقوس کا

اسمیں سیکڑوں چرکے دئے
جس سے منہ پر خون نکلا جابجا

دیر تک کرتا رہا یونہی ستم
خط بنا کر جب ذرا فارغ ہوا

توحکیم نامور نے دفعتاً
اسکو اُجرت سے زیادہ کچھ دیا

نائی پیسے کچھ زیادہ دیکھکر
سطناطونیقوس سے کہنے لگا

میری اُجرت اس سے کم ہے اے جناب
آپ نے مجھ کو کیا جو کچھ عطا

جب سنا نائی سے اُسکا یہ کلام
ہنسکے بولا وہ حکیم باصفا

جانتا ہوں آپ کی اُجرت مگر
صرف جاں بخشی کا دیتا ہوں صلا

ہمّت کسی بات کی پروا نہیں کرتی

اک تونگر نے از رہ بخشش
بخشے سایل کو ڈھائی لاکھ درم

جب ملا یہ خزانچی کو حکم
سُنکر اس کو وہ ہو گیا برہم

دل میں سوچا کہ کیا کروں تدبیر
جس سے بچ جائے یہ کثیر رقم

اسلئے رہ گذر میں ڈھیر کئے
جتنے بخشے تھے اُسقدر درہم

تاکہ آقا بدلدے اپنا حکم
ہو کے مقدار مال سے محرم

دیکھا آقا نے جب کہ وہ انبار
ہنس کے بولا کہ یہ درم ہیں کم

کردو ان کو دوچند تم فوراً
کہ نہ محجوب ہوں گدا سے ہم

ایمان کیلئے بیم و رجا دونوں ضروری ہیں

حضرت عیسیٰ سے یحییٰ ایک دن کہنے لگے
تم تو یوں خوش ہو کہ جیسے خوف ہی کوئی نہیں

بولے عیسیٰ اے برعکس آپ ایسے ہیں ملول
جیسے کوئی رحم کی امید باقی ہی نہیں

متاع دنیا کسی کی ملک نہیں

یہ دیکھا حضرت عیسیٰ نے اک دن دو حریفوں کو

کہ اک قطعہ زمیں کے باب میں باہم اشارے ہیں

یہ کہتا ہے کہ میری ہے وہ کہتا ہے کہ میری ہے
لڑائی کے مہیّا الغرض اسباب سارے ہیں
کہا حضرت نے ٹھہرو اک نیا جھگڑا نکل آیا
زمیں ہم سے یہ کہتی ہے کہ یہ دونوں ہمارے ہیں

عبادت خداپرستی کا نام ہے

حضرت عیسے کا اثنائے سفر میں ایکبار ایک ایسی قوم صالح پر ہوا ناگہ گذر
جو رہا کرتی تھی مصروف عبادت رات دن جو جھکائے رکھتی تھی سجدے میں سر شام و سحر
آپنے پوچھا کہ کیوں اے عابدان نیک ذات کیا ہے وہ جسکا کہ تم لوگوں کے دل پر ہے اثر
اس عبادت سے تمھیں کس چیز کی امید ہے اور وہ شے کیا ہے جسکا خوف ہے آٹھوں پہر
بولے جو امید ہے ہمکو ہے جنت کی امید اور جسکا خوف ہے ہمکو ہے وہ نار سقر

حضرت علیہ السلام بہت افسوس سے کہنے لگے
آجتک اصل حقیقت سے ہو تم سب بے خبر

خوف ہے مخلوق سے امید ہے مخلوق کی
الغرض اب تک نہیں پہنچی ہے خالق تک نظر

عاشقان الٰہی سوائے خدا کے کسی کو نہیں دیکھتے

سنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام
کیا کرتے اکثر پیادہ سفر

کسی نے کہا ایک دن آپ سے
کہ لے لیجئے اک گدھا آپ اگر

تو پھر کیوں سفر میں یہ تکلیف ہو
جو اکثر گزرتی ہے اب آپ پر

وہ جب کر چکا ختم اپنا کلام
تو حضرت یہ بولے کہ اے بیخبر

نہیں ہوں میں کچھ اسقدر بے شعور
نہیں ہوں میں کچھ اسقدر خیرہ سر

کہ ڈالوں کبھی اک گدھے کی طرف
خدا کی طرف سے نظر پھیر کر

خدا کو آزمانا بے ادبی ہے

کہا شیطان نے عیسیٰ سے اک روز — کہ خود کو تو پہاڑی سے گرائے

تو پھر دیکھوں کہ وہ اللہ تیرا — تجھے کس طرح مرنے سے بچائے

ہنسے اور ہنس کے آنحضرت نے اسکو — یہ دو کلمے نصیحت کے سنائے

کسی بندے کو یہ زیبا نہیں ہے — کہ وہ اپنے خدا کو آزمائے

اخلاق ہر انسان کیلئے ضروری ہے

محفل میں دھلائے حضرت عیسیٰ نے — حواریوں کے ہاتھ جو از بعد طعام

کہنے لگے دست بستہ سب حواری — زیبا تھا کہ ہم دیتے یہ خدمت انجام

حضرت نے کہا کہ سچ ہے یہ بات مگر — میں نے بھی اسی لئے کیا ہے یہ کام

بدی چھپ نہیں سکتی

ایک حاکم کو دی گئی رشوت — مسترد کر دی اُسنے یہ کہہ کر
کہ سُنے گی جو یہ خبر دُنیا — حرف آئیگا میری عزت پر
مُرتشی بُولا میں ہوں اور تم ہو — تیسرا کوئی بھی نہیں ہی بشر
تو پھر اب آپ ہی بتائیں مجھے — منکشف ہوگا راز یہ کیونکر
بولا حاکم کہ یہ غلط ہی جناب — محرم راز ہو چکے اکثر
مجھ کو معلوم آپ کو معلوم — آسماں کو خبر زمیں کو خبر

اب ذرا آپ غور فرمائیں
چھپ سکے گا یہ راز پھر کیونکر

لباس پر فخر کرنا بیجا ہی

پھرتا تھا اک شخص اتراتا ہوا ۔ پوستیں رنگا ہوا تھا جس کے پاس
دیکھ کر اُسکو یہ بولا اک حکیم ۔ فخر کیا کرتا ہے اے حق ناشناس
کل جسے پہنے ہوئے تھی ایک بھیڑ ۔ آج تو پہنے ہوئے ہی وہ لباس

نسب کی صحیح پہچان

لڑائی میں دشمن سے لڑنے گیا ۔ جو اک بار لڑکا لبطولاس کا
کسی نے لبطولاس کو دی خبر ۔ کہ مارا گیا آج بیٹا ترا
کہا باپ کا اپنے بیٹا تھا وہ ۔ تو مرنے میں اسکے تعجب ہی کیا
مگر بعد کو جب ہوئی یہ خبر ۔ کہ زندہ تو ہے قید میں پڑ گیا

تو ہنسکر یہ کہنے لگا وہ حکیم — کہاں اپنی ماں کا بھی بیٹا وہ تھا،

زور پر گھمنڈ کرنا بیجا ہی

رہتا تھا یونان میں اک پہلواں — جس کو طاقت پر بڑا ہی ناز تھا

رات دن رہتا تھا مصروف گزاف — روز و شب کرتا تھا وہ اپنی ثنا

تھا کہیں محو تعلّی ایک دن — اسپہ جالینوس نے اُس سے کہا

یہ بتاؤ تم مجھے اے مہرباں — کام کیا سب سے بڑا تم نے کیا

بولا میں اک روز مردہ بیل کو — پیٹھ پر تنہا اُٹھا کر لے گیا

ناز سے اُسنے دیا جب یہ جواب — ہنسکے جالینوس یہ کہنے لگا

بھائی یہ تو کام معمولی سا ہے — بیل خود حامل ہی اپنے بوجھ کا

ہو زیادہ سے زیادہ بیل تم — آدمیت سے مگر کیا واسطا

تعینِ مدّتِ حیات

ارسطو سے دورانِ تقریر میں
کہ کب مرنا انسان کو چاہیئے

فلاطوں نے پوچھا بتا اے عزیز
کہا جب نہ ہو نیک و بد کی تمیز

بُو الہوسی

کہا ایک عابد سے انکاس نے
بامید جنّت جو طاعت کرے

کہ اے نیکدل دو بین نکتہ رس
ہے سب سے زیادہ وہی بوالہوس

آخر فنا آخر فنا

اردشیر بابکاں نے ایک بار
خاص کوئی خوابگہ بنوائی تھی

جس میں دولت خرچ کی تھی بیشمار ۔۔۔ اور کچھ باقی نہ رکھی تھی کمی

اک حکیم نکتہ رس نے دیکھ کر ۔۔۔ شاہ سے بے انتہا تعریف کی

شاہ نے پوچھا کہ سچ کہہ اے حکیم ۔۔۔ تو نے اس میں عیب بھی پایا کوئی

وہ حکیم نکتہ رس بولا کہ ہاں ۔۔۔ غور کرنے پر کھلا اک عیب بھی

اور وہ یہ ہی کہ اکدن اس سے تم ۔۔۔ جا کے پھر اسمیں نہ آؤ گے کبھی

تجارت بادشاہوں کا کام نہیں ہی

ہرمز کو خزانچی نے لکھا ۔۔۔ اے مالک تاج و تخت و دولت

لائے تھے یہاں پہ چند تاجر ۔۔۔ موتی خوش وضع خوبصورت

تو شاہی خزانہ والنے کچھ ۔۔۔ موتی وہ خریدے تھے بہ قیمت

اب آیا ہی اور ایک تاجر ۔۔۔ دیتا ہے وہ انکی دونی قیمت

ہو حکم تو بیچ لوں انھیں میں
ملتا ہے یہ نفع بے اذیت

پھر شمر نے جواب میں یہ لکھا
ہے یہ اک قسم کی تجارت

لیکن جو یہ پیشہ ہم کرینگے
تو کون کرے گا پھر حکومت

انصاف

عہد قبا میں کہیں پائی گئی تھی ایک لاش
قاتل بدشعار کی سب کو بڑی تلاش تھی
پھرتے تھے لوگ جا بجا شہر میں ڈھونڈتے ہوئے
پھر بھی کسی طرح کہیں چل نہ سکا پتا کوئی
ہو نہ سکا جو کوتوال پانے میں اسکے کامیاب
تو کسی بے خطا کے سر ساری خطا یہ تھوپ دی

دام بلا میں وہ غریب جب ہوا اس طرح سے قید
کھائیں ہزارہا قسم کرکے بہت سی عاجزی
پھر نہ کیا کچھ التفات حاکم وقت نے مگر
اور سزائے دار بھی اُس کے لیئے لکھی گئی
تختے پہ سولی کے اُسے جبکہ چڑھا دیا گیا
تو بڑھا چیرتا ہوا بھیڑ کو ایک آدمی
اور کہا کوتوال سے میں نے کیا ہے اسکو قتل
بے سبب اس غریب کو جس کی کہ یہ سزا ملی
اُسکو پکڑ کے کوتوال لیگیا پاس شاہ کے
شاہ نے سُن کے انکا حال دونوں کو کردیا بری
پوچھا سبب تو یہ کہا شاہ نے کوتوال سے

چھوڑ دو اِن کو کیونکہ ہی عدل کا مقتضا یہی
مجرمِ قتل ہے تو یہ لائق رحم بھی تو ہی
ایک کی اِسنے جان لی ایک کو اسنے جان دی

صلۂ احسان

سُنا گیا ہی کہ فصل ربیع میں اک روز
ہوا سوار جو کسریٰ برائے سیر و شکار

نظر پڑا اُسے جنگل میں کوئی پیر خرف
بحال خستہ بحال تباہ زار و نزار

لگا رہا تھا وہ زیتون کا درخت کوئی
زمین کھود کے تھالا کیا تھا اک تیار

یہ دیکھ کر کہا کسریٰ نے اُس سے اے بڈھے
اُٹھا رہا ہی بھلا کیوں زحمت بیکار

پھلے گا تیرا لگایا ہوا شجر جب تک
نہ دیگی مہلت ہستی اجل تجھے زنہار

دیا جواب بڈھے نے شاہ کو فوراً
کہ اے شہنشہ گیتی پناہ نیک شعار

پھل اُنکے کھائے ہیں ہمنے بذوق و شوق اسوقت ۔ ہمارے پُرکھوں نے جتنے لگائے تھے اشجار

اسی طرح سے وہ پودے جو ہم لگاتے ہیں ۔ ہمارے بعد کے لوگ اُن کو پائیں گے تیار

سُنی یہ بات تو کسریٰ نے زہ[1] کہا فوراً ۔ درم دئیے گئے بڈھے کو اسے چار ہزار

ملے درم تو مسرت کے ساتھ بڈھے نے ۔ کہا یہ عرض ہے اے شاہ واجب الاظہار

درخت پھلتا ہی ہے بعد ایک عمر کے لیکن ۔ مرے درخت پہ درم پھر میں آگیا یہ بار

یہ سن کے شاہ نے پھر زہ کہا تو حسب رواج ۔ خزانچی نے دئیے پھر درم وکر کے شمار

خوشی میں بڈھے نے نوشیرواں سے پھر یہ کہا ۔ کہ ایکبار زمانہ میں پھلتے ہیں اشجار

مگر خدا کی عنایت سے دیکھلے اے شاہ ۔ کہ یہ درخت پھلا ایک وقت میں دو بار

---

[1] نوشیرواں جب کسی کی بات پر "زہ" کہتا تھا تو فوراً چار ہزار درم انعام دئے جاتے تھے ۱۲

رعایا کا متمول ہونا بادشاہ کی خوشی کا باعث ہے

مخبروں نے شاہ کسریٰ کو لکھا | آپ کا جو ہے فلاں تحویلدار
اسقدر پیدا کیا ہے اُسنے زر | ہو نہیں سکتا ہی کچھ جس کا شمار
جتنا اُسکے پاس ہی آج اتنا زر | گنج شاہی میں نہیں ہی زینہار
اُن کو کسریٰ نے لکھا اسکا جواب | مجھ کو اس سے کچھ نہیں ہی رنج و عار
بلکہ میں خوش ہوں کہ میرے عہد میں | لوگ ہیں مجھ سے زیادہ مالدار

موت سے کس کو رستگاری ہی
آج وہ کل ہماری باری ہی

آکے اک شخص نے کسریٰ کو دیا یہ مژدہ | کہ خدا نے ترے دشمن کو اُٹھایا شاہا

کہا اُس سے کہا تو نے کہیں بھی سنا	کہ ہمیشہ کیلئے اُسنے ہمیں چھوڑ دیا

دنیا میں عقلمندوں کی تعداد کم ہے

کسی نے کہا شاہ بہلول سے	اگر کر شہر کے احمقوں کا شمار
کہا اُن کا گننا تو دشوار ہے	اُنھیں کیوں نہ گنئے جو ہیں ہوشیار

قطعات تمام ہوئے اب رباعیات ملاحظہ فرمائیے
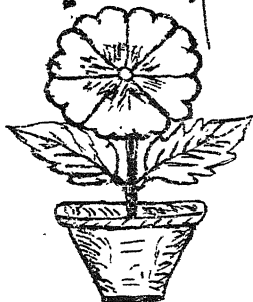
رُباعیات

کوئی گُل عیش چن لیا ہو شاید
مشکیں نفس اُس سے ہوگیا ہو شاید
سنتا ہوں کہ کچھ روز جیا تھا میں بھی
کچھ یاد نہیں یہی ہوا ہو شاید

ظالم دم نزع بھی نہ آیا افسوس
افسانۂ غم نہ سننے پایا افسوس
تھی جذبۂ دل سے ہمکو آسی امید
افسوس عجب فریب کھایا افسوس

جانا نہ کسی نے معنی مطلق کو
اس سبز و سپید و سرخ و استبرق کو
بیکار نہیں ہیں یہ بہتّر فرقے
برحق سمجھے اگر تو سمجھے حق کو

پی خوب شراب اور معشوق سے مل
بیکار ہی کل کی فکر آج اے غافل
کل کام پڑے گا بے نیازی سے ترا
ہیں سب یہ خیال اور عمل لاحاصل

عاشق ہی نہو کوئی تو پھر یار سے کیا
مشتاق نہو کوئی تو دیدار سے کیا
آنکھیں ہی نہ جسکے پاس ہوں اے ساقی
اُس کو ظلمت سے کیا اور انوار سے کیا

وقف آلام و عبرت و حسرت ہے
انسان غریب کی بھی کیا قسمت ہے
آتی نہیں موت بے سبب کے یعنی
مرنے کی بھی اک مقررہ قیمت ہے

ہرگز دل اپنا بیوفاؤں کو نہ دے
آئینۂ صاف خودنماؤں کو نہ دے
بیگانے تو بیگانے ہیں پھر اے آسی
تو اس کا نشان آشناؤں کو نہ دے

قبل اسکے کہ زندگی کا برہم ہو نظام
وہ کام کرو کہ ہو نہ خفت انجام
جس کام کو کل پہ ٹالتے رہتے ہو
شاید کہ نہ کر سکو گے کل تم وہ کام

اسرار وجود خام و ناپختہ رہے
جو گوہر بے بہا تھے ناسفتہ رہے
ہر اک نے فضول اسمیں تقریریں کیں
جو نکتے کہ گفتنی تھے ناگفتہ رہے

کس طرح ہر اک وفا سے دیوانہ ہو
کیونکر ہر اک خرد سے بیگانہ ہو
سو قرن میں بھی نہ ہوگا پیدا آسی
وہ مرد کہ جس میں خوئے مردانہ ہو

ہے عالم فانی میں فقط قید وجو
ہیں عالم باقی میں نمائش کے حدو
تم عبد جو سنتے ہو یہ ہے فرضی نا
دراصل یہ ہے کہ ہے فقط وہ معبو

کچھ بھی نہیں ہیں یہ کفر و ایماں دونوں
کچھ بھی نہیں یہ گبر و مسلماں دونوں
جب راز حقیقت سے اٹھایا پردہ
رونے لگے ہوہو کے پشیماں دونوں

سرسبز نہو سکے گا یہ دانۂ حرص
معمور نہ ہو سکے گا ویرانۂ حرص
اک ظرف شکستہ بنکے خالی ہوگا
جتنا کہ بھریگا کوئی پیمانۂ حرص

سو سال کرے تو شادمانی بالفرض
سو سال کرے تو کامرانی بالفرض
مرگ پیری سے پھر بھی ہوگا دوچار
سو سال بھی ہو جو زندگانی بالفرض

جو دل ہے یہاں غموں کا گنجینہ ہے
داغوں سے بھرا ہوا جو سینہ ہے
میں بھی حیران ہوں اور جہاں بھی حیراں
آئینہ کے سامنے اک آئینہ ہے

ہونٹوں کو ہنسی سے آہ سینا ہی پڑا
جام مے رنج و غصّہ پینا ہی پڑا
موت اپنی مراد پر نہ آئی افسوس
اوروں کی مراد بنکے جینا ہی پڑا

وہ جلوہ بہ دیدۂ یار ہو جائیگا
راز اُس کا سب آشکار ہو جائیگا
ہم آئینہ ہیں تو وہ خود بیں آسی
آخر ہم سے دوچار ہو جائیگا

ہیں جاہل محض گرچہ باعرفاں ہیں
بچّے ہیں ہنوز گو مطول خواں ہیں
آموختہ کے سوا نہیں آتا کچھ
یعنی دانا تو ہیں مگر ناداں ہیں

ادنیٰ ہیں اگرچہ ہم بہت اعلیٰ ہیں
پتھر ہیں دراصل ظاہرا ہیرا ہیں
اک حرف بجز نام کے معلوم نہیں
خاتم ہیں کہ صرف مظہر اسما ہیں

کیا روئے جو شام غم میں تنہا روئے
کیا روئے جو چشم نم سے دریا روئے
ایذا طلبی یہ چاہتی ہے آسیؔ
ہم روئیں تو ساتھ ساتھ دنیا روئے

اب علم و ہنر سے سخت حیراں ہوں میں
حیراں ہی نہیں بلکہ پریشاں ہوں میں
پرساں نہیں اس جنس کا دنیا میں کوئی
آئینہ فروش شہر کوراں ہوں میں

دلکش ہے جہاں کسقدر دیکھے تو
ہیں اہل ہنر بہت ہنر دیکھے تو
دنیا کے ہر اک چاہ میں اک یوسف ہے
لیکن کوئی صاحب نظر دیکھے تو

شایانِ ملامت دو عالم ہم ہیں
مستوجب طعنہائے پیہم ہم ہیں
رکھتے ہیں چراغ کعبہ بتخانہ میں
بدنام کن دودۂ عالم ہم ہیں

خوش آئے تھے اِس جہاں سے غمناک چلے
پاک آئے تھے اور سخت ناپاک چلے
اِس آمد و شد سے کیا نتیجہ نکلا
کیا خاک آئے تھے اور کیا خاک چلے

دعوئے جو رہ عشق میں کافی ہو جائے
تقریر جو وجہ سینہ صافی ہو جائے
جو دار پہ چڑھ جائے وہ منصور بنے
جو برہنہ پا ہو بشر حافی ہو جائے

خلعت راحت کا تن پہ پہنا کیسا
جام صہبائے عشق پینا کیسا
ہم ہیں اور درد و یاس و ناکامی ہے
مرنا بھی نہیں نصیب جینا کیسا

گر علم کا اک ورق میسر ہو جائے
انساں کو نہ چاہیئے کہ خودسر ہو جائے
آجائے جو انقلاب کا اک جھونکا
شیرازۂ کونین ابھی ابتر ہو جائے

اس عشرت بے بقا سے خوشدل کیوں ہے
اس کلفت جانگزا سے بسمل کیوں ہے
یہ کچھ نہیں دونوں ہیچ ہیں اے آسی
اے مرد خدا خدا سے غافل کیوں ہے

رنگ عشرت نے ہمسے بیرنگی کی
نغموں نے ہمارے خارج آہنگی کی
جس سینہ میں اک جہاں سما سکتا تھا
آخر یک نفس سے اُسنے دلتنگی کی

سامان راحت کا کوئی موجود نہیں
اک چیز بھی پاس حسب مقصود نہیں
لیکن یہ خیال اک بہشت دل ہے
معبود خدا ہے اور معبود نہیں

وہ نقطۂ نور اگر نہ پیدا ہوتا
کیوں دائرۂ فلک ہویدا ہوتا
محبوب خدا اگر نہ بنتے احمد
والہ ہوتا کوئی نہ شیدا ہوتا

پیغام خدا کا پہلے آدم لائے
آخر میں بشارت ابن مریم لائے
سب نبیوں کے پاس نامہ بے خاتم تھا
احمد صلعم ہمراہ نامہ خاتم لائے

جو گور پرستی میں ہوئے ہیں سرمست
وہ دین کی راہ سے ہیں گمرہ یکدست
اللہ نے ہم میں اُن میں رکھا ہے فرق
ہم زندہ پرست ہیں وہ سب مردہ پرست

ہم منکرِ اولیاء و اخیار نہیں
ہم اُن سے کشیدہ مثلِ اشرار نہیں
لیکن خالق کو چھوڑ کر اے آسیؔ
مُردوں سے اعانت کی طلبگار نہیں

ہے کون وفا دے زمانہ کا نظام
ہر صبح کے ساتھ میں لگی ہے اک شام
جھونکا ہے ہوا کا زندگی اے غافل
جھپکی اِدھر آنکھ اور اُدھر کام تمام

مطرب فانی ہے اور ساقی فانی
تو اور ترا ہر اک مُلاقی فانی
بے بود ہے بود اس جہان کی ہستی
باقی باقی ہے اور باقی فانی

ہر بزم میں اک قرب اسے حاصل تھا
یہ باعث ہنگامۂ صد محفل تھا
جس پر سے گزر رہا ہے تو اے غافل
یہ مُشت غبار بھی کسی دن دل تھا

حیران زمانہ کو بنایا ہم نے
اک نغمۂ بے صدا سنایا ہم نے
آئینۂ وہم میں مثال تصویر
جو جلوہ کہ کچھ نہ تھا دکھایا ہم نے

بے بود میں شان بود پیدا کرنا
اور ظاہر حسن خود میں اخفا کرنا
کاغذ کی طرح آگ لگا لے دل میں
گر چاہے ہزار طرح جلوا کرنا

جھگڑا ہی مروّت کا نہ پالا ہم نے
احباب پہ بار اپنا نہ ڈالا ہم نے
درماندگی و فتادگی میں آسی
سایہ کی طرح خود کو سنبھالا ہم نے

کب تک یہ غموں سے ٹھنڈی سانسیں بھرنا
کب تک یہ رنج اور تاسّف کرنا
کب تک مرنے سے یہ تنفر آسی
کب تک اس زندگی کے اوپر مرنا

افسانۂ شوق متصل کہتا ہوں
کہنے سے خجل ہوں اور خجل کہتا ہوں
سمجھا نہیں قافلہ مرے مقصد کو
ہیں بانگ جرس میں درد دل کہتا ہوں

عصیاں میں زمانہ بھر پہ غالب ہوں میں
شرسے یک جان اور دو قالب ہوں میں
وجہ بخشش نہیں ہے کوئی یارب
آمرزش بے سبب کا طالب ہوں میں

اس سے پہلے کہ تیرے دل کو توڑیں
اس سے پہلے کہ باگ تجھ سے موڑیں
لوگوں کو تو خود ہی چھوڑ دے اے آسی
اس سے پہلے کہ لوگ تجھ کو چھوڑیں

مامون بلا ہوں اور خطر میں بھی ہوں میں
منزل پہ پہونچ کے رہگزر میں ہوں میں
ہوں رشتۂ تسبیح کا دانہ یعنی
اپنے گھر میں ہوں اور سفر میں ہوں میں

تھے زیست سے اپنے ہاتھ سے دھوئے ہم
اپنی ہستی پہ خوب سا روئے ہم
تھی مثل شرار زندگی کی فرصت
آنکھیں کھولیں نہ تھیں کہ پھر سوئے ہم

کچھ درد و الم جہاں سے کہنا ہوگا
کچھ رنج فشار قبر سہنا ہوگا
کچھ روز اڑیں گے خاک بنکر ہر سمت
سو طرح سے اس جہاں میں رہنا ہوگا

ہیں گرچہ ہزار رنج سہنے والے
ہم پھر بھی ہیں بات منھ پہ کہنے والے
ہم تجھ سے دبے ہوئے ہیں لیکن اے چرخ
نا کے نہیں تجھ سے دب کے رہنے والے

سب کو دم سرد اس جگہ بھرنا ہے
سب کو اسی ایک حال میں مرنا ہے
جو بندۂ حق نہیں وہ ہے بندۂ نفس
بندے کو غرض کہ بندگی کرنا ہے

نکتہ ہی یہ اس میں بات کچھ بیش نہ کم
اطلاق ہی اسکا سب پہ وہ تم ہو کہ ہم
ہستی سے تمہاری خود فنا ہی ظاہر
اے مثل سراب نقشبندان عدم

یا نغموں کی صوت جانفزا نکلے گی
یا نالوں کی صوت جانگزا نکلے گی
جب تک باقی رہے گا یہ تار نفس
دل سے ترے اک نئی اک صدا نکلے گی

کیوں ہستیٔ بے بقا پہ اتراتا ہے
کیوں نشہ سے تیرا سر پھرا جاتا ہے
آئینہ میں اپنے عکس کو دیکھ ذرا
اک اور جہاں میں نظر آتا ہے

راحت دنیا میں رہ کے آساں نہ سمجھ
آرام کا اس جہاں میں امکاں نہ سمجھ
جب باغ میں کوئی گل نظر آئے تجھے
دل ریش سمجھ اُسے تو خنداں نہ سمجھ

بے لشکر و فوج بادشاہی کر لے
بے مسند و تکیہ کبریائی کر لے
دنیا سے جب بے نیاز ہو جائے تو
اک دلق مرقع میں خدائی کر لے

قدرت کا تری بندۂ دیرینہ ہوں میں
اور تیرے کمالات کا گنجینہ ہوں میں
تو مجھ سے ہے ظاہر اور میں تجھ سے ہوں عیاں
تو آئینہ میرا تیرا آئینہ ہوں میں

تھے دورِ حیات میں خوشی سے محروم
آخر کو ہوئے اجل کے اپنی محکوم
القصہ رہی ہمیشہ محتاج مرور
اور عیش و سرور کا زمانہ معلوم

تدبیریں کبھی مفید ہوتی بھی ہیں
اکثر یہ تیرا وقت کھوتی بھی ہیں
دل تنگ نہو کبھی تو ان سے آسیؔ
دریا میں حباب بھی ہیں موتی بھی ہیں

ہوتی ہے خوشی کی صرف غم سے تائید
بعد رمضاں ہمیشہ آتی ہے عید
ہوتا نہ یہی اگر تو ہوتے کیونکر
کفار کے ہاتھ سے مسلمان شہید

عاشق بھی ہے اُمید سے مسرور بھی ہے
اور اُس میں خیال دوست کا نور بھی ہے
میں اس دل مبتلا سے خوش ہوں آسی
موسیٰ بھی ہے یہ شجر بھی ہے طور بھی ہے

اے زاہد خود نما ذرا خوف تو کر
اتنا تو نہ ہو سر کو جھکا کر خود سر
ہنستا ہے زمانہ اور روتی ہے عمر
اس تیری نماز اور ترے روزہ پر

کب کوئی کسی کا مونس ہمدم ہے
بنیاد وفا کی سخت نامحکم ہے
لیکن ترا غم ہے تیرے دل کا مونس
باقی ہے اگر یہ غم تو پھر کیا غم ہے

دراصل ہوا ہے اب یہ قصّا حادث
کیسا کوئی قدیم کیسا حادث
تھی علم الٰہی میں ہمیشہ سے یہ بات
گویا کہ قدیم سے ہے دنیا حادث

شاید غم سے کبھی فسردہ ہو جائے
شاید گل کی طرح فسردہ ہو جائے
زندہ ہے جو آج دل تو دل شاد بھی ہو
ممکن ہے کہ آج ہی یہ مردہ ہو جائے

جنّت بھی اگر نہو تو جنّت ملجائے
نعمت بھی اگر نہو تو نعمت ملجائے
سب کچھ ہے وہ میرے واسطے اے آسیؔ
دل کو اگر ایک آہ حسرت ملجائے

دن رات وہی شورش غم اور وہی تاب
دن رات وہی مصیبت اور رنج و عذاب
رونے میں کہاں سونے کی فرصت آسیؔ
ہے آج خیال خواب اک نقش برآب

انساں کیلئے یہ عمر فانی ہے موت
انساں کیلئے یہ زندگانی ہے موت
ڈرتے ہیں جوانی میں عبث مرنے سے
سو موت کی ایک یہ جوانی ہے موت

جاتا ہوں تری گلی سے زاری لیکر
آشفتہ سری و بیقراری لیکر
دل مفت نہیں دیا ہے تجھ کو لینے
جاتا ہوں میں تیری یادگاری لیکر

اللہ رے یہ جذبِ آہ کی بے اثری
اللہ رے یہ درد اور یہ خونین جگری
دریوزہ کے واسطے نہیں ہے کاسہ
کاسہ کیلئے کرتا ہوں دریوزہ گری

مشکل سے یہ شکل خوشنما نکلی ہے
مشکل سے یہ صوتِ دلربا نکلی ہے
ہستی و عدم کا ٹل گیا ہے جب ساز
تب زیست کی جانفزا صدا نکلی ہے

کتنی یہ عمرِ بے بقا نکلی ہے
کیا اِس کو سمجھ رہا تھا کیا نکلی ہے
آئینہ کو دیکھ کر یہ جانا میں نے
ہستی میری عدم میں جا نکلی ہے

اِس دل میں کبھی خوشی کا عنواں دیکھا
اِس دل میں کبھی درد کا ساماں دیکھا
القصہ اسی میں عمر گزری آسیؔ
اک بحر میں سو طرح کا طوفاں دیکھا

اس ذکر خوارق و کرامات کو چھوڑ
اس فخر کو چھوڑ اس مباہات کو چھوڑ
باتیں کرنا ہیں گر تجھے اے زاہد
کچھ اور ہی ذکر کر خرافات کو چھوڑ

ذوق تجرید میرا سرمایہ ہے
رنگ تفرید میرا پیرایہ ہے
تنہائی ہے میری صرف ہمدم میری
ہمسایہ مرا فقط مرا سایہ ہے

مانا کہ تو ہر راز نہاں کو سمجھا
مانا کہ تو راز دو جہاں کو سمجھا
کیا فائدہ لیکن اس سمجھ سے آسی
اب تک جو نہ اپنی چیستاں کو سمجھا

طے منزل غم کو عمر بھر میں نے کیا
اس راہ کو قطع بخطر میں نے کیا
ہر آبلۂ پا کی طرح اے آسی
اس دشت میں سر کے بل سفر میں نے کیا

اک محفل عیش میں ہوا میرا گذر
دیکھا اک خشک پھول کو مجمر پر
پوچھا میں نے کہ کیوں جلاتے ہیں تجھے
بولا کہ چمن میں ہنس لیا تھا دم بھر

وصلت کا کوئی اثر نہ دیکھا میں نے
دیدار کا کچھ ثمر نہ دیکھا میں نے
میں آئینۂ جمال دلبر نکلا
اُس نے دیکھا مگر نہ دیکھا میں نے

ہمّت جو ذرا قدم بڑھائے تو چلیں
یہ درد یہ اضطراب جائے تو چلیں
ہستی ہے فقط غبار راہ مقصود
دم بھر یہ غبار بیٹھ جائے تو چلیں

یہ جام بدست و توبہ برلب کیا ہے
یہ عشق بتاں یہ شور یارب کیا ہے
کیسی ہے الٰہی یہ تلوّن کیشی
میں کون ہوں اور میرا مذہب کیا ہے

سب کو موہوم اور مخیّل سمجھو
موجود جہاں وجودِ اول سمجھو
جو نقش بجز ایک کے آنکھ ہے نظر
تم اُسکو فریب چشم احول سمجھو

باتوں میں تو اختیار شیرینی کر
اظہار نیاز و عجز و مسکینی کر
خواہش ہو جو آنکھوں میں جگہ پانے کی
اے مردمِ دیدہ ترک خود بینی کر

اک زحمتِ ناروا ہی راحت کیا ہی
اک کلفت غم فزا ہی عشرت کیا ہی
دل سا جوہر سہی مگر اے آسی
جب ٹوٹ گیا تو اسکی قیمت کیا ہی

کیا سُرخ ہی کتنا خوشنما ہے لالہ
تجھکو معلوم ہی کہ کیا ہے لالہ
لالہ سے بھی بڑھکے تھا وہ گل اے آسی
جس لالہ کی خاک سے اُگا ہے لالہ

بے کلفتِ دل فشار میں رہتا ہوں
بے نشۂ مے خمار میں رہتا ہوں
طاعت نہیں اور اُمید آمرزش ہے
بے وعدہ کے انتظار میں رہتا ہوں

پہلے سے جو تھی وہی ہوا ہے اب تک
جو رنگ کہ تھا وہی جما ہے اب تک
مدّت سے شرابِ خونِ دل پیتا ہوں
پیمانۂ دل مگر بھرا ہے اب تک

ہے ہستی چند روزہ کیا مایۂ شر

اس رنج سے بہ گیا جگر خوں ہو کر

دنیا کے قیام میں بھی لاکھوں آفات

اور اس سے زیادہ سخت عقبےٰ کا سفر

دل مٹ گیا آہ نارسا باقی ہے

طاقت نہیں نالہ و بکا باقی ہے

کچھ حال نہیں ہے مجھ میں اور ہے وہی حال

اب ساز نہیں رہا صدا باقی ہے

افسانۂ سوزش نہانی نہ سنو
حال غم و رنج زندگانی نہ سنو
میں آپ اب اپنی ناخوشی سے خوش ہوں
اچھا نہ سنو مری کہانی نہ سنو

ہستی و فنا کے غم سے بالا ہوں میں
موت اور حیات سے مبرّا ہوں میں
خود اپنی غرض کے واسطے ہوں جوہر
دانے میں شجر میں دانا ہوں میں

میں روز سحر کو سینہ شق ہوتا ہوں
اور شام کو خوں جوں شفق ہوتا ہوں
اس ہستی بے ثبات کے غم میں مدام
شبنم کی طرح عرق عرق ہوتا ہوں

راحت میں کبھی تلف ہوئے بیہودہ
کلفت میں پڑے رہے کبھی آلودہ
گلگشت خیال کرتے کرتے آسیؔ
ہم گردش رنگ سے ہوئے فرسودہ

وہ سر بھی نہیں وہ جوشِ سودا بھی نہیں
وہ یاس وہ درد روح فرسا بھی نہیں
جتنی کہ خرابیاں تھیں سب ہم سے تھیں
دنیا میں نہیں ہیں ہم تو دنیا بھی نہیں

اس طرح بنائے شعر ڈالی میں نے
گویا کہ نئی راہ نکالی میں نے
بلبل سے اڑائی تھی روش جو میری
بلبل کی وہی روش اڑالی میں نے

جاری ہے مری شرابخواری ابتک
رود اور سرود سے یاری ابتک
گو بال سفید ہیں مگر باقی ہے
دل میں ہوس سیاہ کاری ابتک

نغموں میں بھی ہے صدائے ماتم باقی
ہے وصل میں بھی فراق کا غم باقی
دریا ہونٹوں پر آگیا ہے لیکن
ہے اب بھی وہ تشنگی کا عالم باقی

بیخود بھی ہیں حیران بھی ہیں انجان بھی ہیں
عاقل بھی ہیں عالم بھی ہیں نادان بھی ہیں
نیرنگیٔ جلوہ ہائے اصنام کو دیکھ
بتخانے میں کچھ لوگ مسلمان بھی ہیں

اس زھد کی آبرو ڈبو لے پہلے
دامن کو شراب سے بھگو لے پہلے
پھر دل سے صفائے دل کی کوشش کرنا
آلودۂ معصیت تو ہو لے پہلے

ہنستے ہوئے آئیں اور رُلاتے جائیں
دلداری کو آئیں دل دکھاتے جائیں
احباب کی شان ہو یہ آتی صاحب
ایک ایک کو آپ آزماتے جائیں

رنجوں کی طرف خوشی کو مائل کر لے
مایوس بن اور مراد حاصل کر لے
ملتی ہے اسی طرح حیات ابدی
جا موت کو زندگی میں شامل کر لے

میں لپٹ کے ہوا حنا کی صورت پا بوس
اُمید بڑھی ہے سب سے ہوکر پابوس
ہوں بالغ جہاں میں بید مجنوں کی طرح
ہوتی ہے مرے یہاں ترقی معکوس

انجام سُرور درد و کلفت نکلا
رہنا دنیا میں سخت آفت نکلا
پڑتے ہی طمانچۂ مغنی اجل
اس دائرہ سے صدا کی صورت نکلا

ہو لاکھ اگرچہ آج تو فرزانہ
آخر میں کہیں گے تجھ کو سب دیوانہ
پیمانۂ عیش جلد بھر کر پی لے
بھرتا ہے وگرنہ عمر کا پیمانہ

جز حُسن یہاں عیاں نہیں ہے کوئی
جز عشق یہاں نشاں نہیں ہے کوئی
یا تیرے سوا نہیں کسی کا بھی وجود
یا میرے سوا یہاں نہیں ہے کوئی

جب دل ہی نہیں رہا تو ارماں کیسا،
جب درد نہیں رہا تو درماں کیسا،
غمہائے جہاں سے میں سراپا غم ہوں
اب دل میں کوئی خوشی کا ساماں کیسا

ہر دم جو بدلتی ہے زمانہ کی ہوا
پھر بود و نبود کا ہے تجھ کو غم کیا
موجود جو شے ہے اُسکو معدوم سمجھ
معدوم جو شے ہے اس کو موجود بتا

آسی چپ رہ سخن طرازی کب تک
افسونگری اور فسانہ سازی کب تک
اظہار حقائق اور سخنگوئی میں
اے مرد خدا خیال بازی کب تک
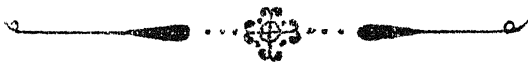
تتمہ از مصنف

کون سی شاعری جذبات انگیز ہے کس سے تاثیر و تاثر
پیدا ہوتے ہیں اور کونسی شاعری ملک و قوم کی مفید خدمات انجا
دے سکتی ہے۔ شعر کی بندش کیسی ہونی چاہیئے۔ اُس میں کس قسم
کے الفاظ لائے جائیں۔ اور کن سے احتراز کیا جائے۔
مضامین و مطالب میں کسقدر صفائی اور کہاں تک گہرائی کی
ضرورت ہے یہ ایک طویل مبحث ہے۔ جس کی نہ یہ چھو
سی کتاب متحمل ہو سکتی ہے۔ نہ یہاں اُس کی ضرورت ہے
اور نہ میں لکھنا چاہتا ہوں مگر یہ لکھنا ضروری ہے کہ میں
کیوں اس قسم کی شاعری کی طرف توجہ کی۔ اسپر بھی جب غو
کرتا ہوں تو ایسے بہتم بالشان اسباب نہیں معلوم ہوتے جن

تفصیل اور تشریح و توضیح کے لیے کسی بڑے مقدمہ یا تتمہ
کی ضرورت ہو۔ صرف اتنا کہ عرصہ سے یہ خیال تھا کہ کوئی
اخلاقی کتاب نظم میں لکھی جائے مگر جب اس خیال کے پورا کرنیکا
ارادہ ہوتا تھا۔ تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچتا تھا کہ اخلاق و
حکمت کے نکات گو کیسے ہی شاعرانہ اور رنگین الفاظ میں بیان
کیا جائے۔ پھر بھی اُنکی خشکی دُور نہیں ہوتی۔ اسکی وجہ یہ نہیں
ہے کہ الفاظ کا اثر جاتا رہتا ہے۔ بلکہ طبائع عموماً نصائح سے
کچھ زیادہ مانوس نہیں ہوتیں اور سعدی و عطار و مولانا روم۔ اور
سنائی سے ناصح روز پیدا نہیں ہوتے۔ بس یہی خیال تھا کہ جسنے
ارادہ کو مدت تک ارادہ ہی کی صورت میں رکھا۔ اتفاق
سے ایک دن یہ خیال پیدا ہوا کہ مشہور زمانہ حکماء کے خیالات
سراسر شعریت سے لبریز ہوتے ہیں۔ اُن کو نظم کرنا چاہیے۔ اُن میں

نصائح بھی ہیں اخلاق بھی ہے۔ رموز و حکمت بھی ہیں ۔اور
شعریت بھی ۔ان کو اگر نظم کے سانچے میں ڈھالا جائے تو انکی
دلکشی بڑھے ہی گی کم نہ ہوگی ۔ اس میں بھی صرف اقوال
وہ دلکشی نہیں رکھتے جو اُنھوں نے بغیر کسی تحریک کے
کہے ہیں ۔ بلکہ مکالمہ کی صورت میں جو کچھ اُنھوں نے کہا ہے
وہ سونے اور سہاگے کا عالم رکھتا ہے ۔اس مکالمہ میں بھی
اُس مکالمہ کو ترجیح دی گئی جس میں ایک مہذب شستہ ظرافت
شامل ہو جس سے نہ صرف سُننے والے کے دل و دماغ محظوظ
ہوں نہ صرف روح کو تقویت اور مسرت حاصل ہو بلکہ نصیحت
کی تلخی شیرینی سے بدلکر دل و دماغ کو گوارا ہو جائے ۔ اس
محدود خیال کے لئے مضامین کا مواد اگرچہ کم ہے ۔ مگر پھر بھی
تجسُّس اور تلاش کی جائے تو دفتر کے دفتر تیار ہو جائیں اس

جمع کر نیں مجھے بعض کتابیں ملیں جو میرے مقصد کے لئے بیحد مفید ثابت ہوئیں۔ بہرحال دو چار اقوال نظم کرکے اہل ذوق احباب کو سنائے۔ داد ملی ہمت بڑھی۔ اور آخرکار اس کام کو مفید سمجھ کر کتابی صورت میں لے آیا۔ میرے لئے خود یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ میں اس اہم فرض کی انجام دہی میں کامیاب ہوا یا نہیں اور کامیاب ہوا تو کہاں تک مگر میں نے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال ضرور رکھا ہے۔

(۱) اغراق۔ غلو۔ مبالغہ سے بالکل احتراز کیا ہے۔

(۲) تشبیہات اور استعارے جو ایشیائی شاعری کے لئے روح رواں بنگئے ہیں۔ اور جنھوں نے ایک جگہ اگر زور کلام بڑھایا ہے تو سیکڑوں جگہ شعر کے دفتر کے دفتر غارت کردئے ہیں اُن سے میں نے حتی الوسع قطع نظر کی ہے۔

(۳) روانی اور صفائی کا خصوصیت سے خیال رکھا
اسی لئے زبان میں نامانوس الفاظ نہیں آنے دئیے
(۴) اس کی بحریں مختلف رکھی ہیں تاکہ طبیعت پر
یک رنگی کا بار نہ پڑ سکے۔
(۵) ایجاز و اختصار کو نہ صرف اسی لئے مدنظر رکھا ہے
کہ ظرافت کی جان ہے۔ بلکہ مبالغہ کے اندیشہ نے اطناب
کی طرف جانے ہی نہیں دیا۔ دوسرے قاری یا سامع کی خاطر
نازک کا خیال ہر وقت اسکا سد راہ بنا رہا ہے۔
(۶) بجز ان مستند ہستیوں کے جن کی عظمت آج بھی
دنیا کی نظر میں اتنی ہی ہے جتنی انکی زندگی میں تھی۔ عوام اور معمولی
لوگوں کے اقوال کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے
(۷) جسقدر اقوال لئے گئے ہیں وہ ان مستند کتابوں سے

ہیں جن کا نظر تحقیق میں اعتبار قائم ہو چکا ہے۔ اور اُمید ہے کہ قائم رہیگا۔

(۸) جہاں تک اندازہ کیا جاتا ہے۔ کوئی مکالمہ ایسا نہیں ہے جس میں اخلاق و ظرافت ملی ہوئی نہ ہو

(۹) بعض انبیا کے اقوال بھی نظم ہوئے ہیں مگر اس سے اُمید نہیں ہے کہ کتاب ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے لئے مفید رہیگی اور مذہبیت کے رنگ میں رنگی جائیگی۔

(۱۰) یونانی حکما کے نام بحروں کے بڑی مشکل سے مطیع ہو سکتے ہیں۔ مگر سخت وقتوں کے باوجود بھی بعض جگہ اس انقیاد و مطاوعت کی زنجیروں سے آزاد رہے ہیں۔ وہاں مجبوراً حکیم ہی لکھدیا گیا ہے۔

یہی ہیں وہ تمام باتیں جو خصوصیت کے ساتھ تو نظر

رہی ہیں۔ اور میری مساعی کو ان میں دخل ہے۔ اس پر بھی
یہ بتا دینا ضروری ہے کہ سہل زبان کا خیال رکھنے کے
باوجود بھی بعض الفاظ ایسے ہیں جو شاید بعض نقادوں کے
نزدیک ادق ہونگے یا دوسری طرح سے اُن کی زبان پر
ہونگے۔ مگر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مختلف فیہ طریق
استعمال الفاظ پر انصاف کبھی یک طرفہ فیصلہ کی اجازت نہیں
دیتا۔ میرا اختراع نامقبول ہو تو ہو لیکن اگر میں نے ایک
فرقہ کا اتباع کرتے ہوئے دانستہ اور جائز سمجھ کر کچھ الفاظ
ایسے استعمال کئے ہیں۔ یا کسی جملہ کی ترکیب میں نقاد کی
زبان اور خیال سے علیحدہ رہا ہوں تو یقیناً وہ قابل ملامت
نہیں ہے ذیل میں اس قسم کے جملے یا الفاظ مجملاً درج
کرتا ہوں جو شاید میری عدم واقفیت پر مبنی سمجھے

جائیں

(عیاشیوں) بجائے عیاشی (تنک) بجائے تنک

(کلبۂ تاریک) کلبہ ذرا غیر مانوس سا لفظ ہے (دیکھ کر لقمان

کی بدصورتی کو ایک دن) کو اس میں سے ضرورت ہے

یا اسی قسم کی اور ترکیبیں جن میں روابط و تعلامات کو

حشو اور زائد سمجھا جائے (اس طرح سے) سے زائد

ہے (متاع کا یہ تذکیر استعمال) (محظوظ) غرض کہ اس

قسم کے چند الفاظ آپ کو ملیں گے جن پر ایک معترض

تنقید کی چھوٹی موٹی عمارت تیار کر سکتا ہے۔ مگر نظر

تحقیق میں شاید اُن کا کچھ پایہ نہ ہوگا۔

بہرحال اگر ان کو کمزور بھی سمجھا جائے۔ تب

بھی نظم اور نثر کے فرق کو نظر انداز کر دینا ایک زیادتی

ہو گی۔

میں تو اس قضیہ کو یہ کہہ کر ختم کئے دیتا ہوں کہ یہ ایک سعی ہے جو اگر مشکور ہو تو زہے قسمت۔ ورنہ

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

رباعیات قطعات سے بالکل جدا چیز ہیں۔ مگر انمیں بھی بعض وہ رباعیاں ہیں جن میں اکابر سلف کے اقوال کو دوسری زبانوں کی نظم یا نثر سے لیکر نظم کیا ہے۔ اور اکثر میری ہی ناتمام فکر کا نتیجہ ہیں۔

میرا خیال تھا کہ اُن حکماء کے مختصر حالات اس کتاب میں لکھ دوں جن کا اس میں ذکر ہے۔ مگر چونکہ اس سے کتاب کی طوالت یقینی تھی اور یہ منظور نہیں لہذا خاموشی۔ عبدالباری آسی۔ ۱۷ مارچ ۱۹۱۹ء